New Era Magazine

NEW ERA MAGAZINE.com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

میرے ہمسفر

از علینہ شاہد

www.neweramagazine.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میرے رہبر

از علینہ شاہد

ہماری ویب میں شایع ہونے والے ناولز کے تمام جملہ و حقوق بمعہ مصنفہ کے نام محفوظ ہیں۔ ہمیں اپنی ویب نیو ایرا میگزین(New Era Magazine)کیلئے لکھاریوں کی ضرورت ہے۔اگر آپ ہماری ویب پر اپنا ناول، ناولٹ،افسانہ،کالم،آرٹیکل،شاعری،پوسٹ کروانا چاہیں تو اردو میں ٹائپ کر کے مندرجہ ذیل ذرائع کا استعمال کرتے ہوئے ہمیں بھیج سکتے ہیں۔

(Neramag@gmail.com)

(انشااللہ آپ کی تحریر ایک ہفتے کے اندر اندر ویب پر پوسٹ کر دی جائے گی۔مزید تفصیلات کیلئے اوپر دیئے گئے رابطے کے ذرائع کا استعمال کر سکتے ہیں۔

شکریہ ادارہ: نیو ایرا میگزین

☆☆☆☆☆

اس کی بلیک مرسیڈیز یونیورسٹی میں آکر رکی. یونیورسٹی پوائنٹس ہونے کے باوجود بھی وہ اپنی بلیک مرسیڈیز میں ہی آتی تھی. ڈرائیور نے اتر کر دروازہ کھولا تو وہ جو شہزادی سی بنی بیٹھی تھی فوراً ہی گاڑی سے اتر گئ۔

علی شاہ! گاڑی یہیں چھوڑ دو میں خود ڈرائیو کر کے آجاؤں گی. اس نے اپنے ڈرائیور پر حکم صادر کیا۔

مگر بی بی صاحب نے تو۔۔۔۔۔۔

میں جو کہہ رہی ہوں وہ کرو. اس کی آواز میں رعب تھا۔

جیسا آپ کا حکم.... ڈرائیور نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے. وہ جانتا تھا کہ وہ کچھ بھی کہے مگر بی بی نے کرنی تو اپنی ہی ہے۔

اس نے گاڑی کی چابی اس کی طرف بڑھائی تو اس نے چابی پکڑی اور ہلکا سا مسکرائی گویا اسے جانے کا اشارہ کیا ہو۔

اس نے پورے ایک منٹ تک ڈرائیور کو جاتے دیکھا پھر وہ اپنی منزل کی جانب مڑھ گئ۔

رزلٹ-رزلٹ-رزلٹ.۔۔۔۔۔اس کے ہوش و حواس پر سوار تھا. وہ تیز تیز قدم

بڑھاتی ہوئی اپنے ڈیپارٹمنٹ کی جانب بڑھنے لگی. آج اس کے فائنل ائیر کا رزلٹ آنا تھا. یہ وہ دن تھا جس کا اس کو شدت سے انتظار تھا۔

وہ جس نے بچپن سے لے کر اپنے سر پر ٹاپر کا ریکارڈ سجا رکھا تھا وہ آج بھی ایک ریکارڈ بنانے جا رہی تھی. اس نے زندگی میں جس چیز کی خواہش کی تھی وہ اسے تھالی میں رکھ کر پیش کی گئی تھی. قدرت اس پر ہمیشہ سے مہربان رہی تھی. اسے اپنی زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں لگتی تھی. اس کی زندگی بلکل پرفیکٹ تھی یہاں تک کہ اس کے فرینڈز اس پر رشک کرتے تھے. اللہ نے اسے حسن کی دولت سے نوازہ تھا اور اس پر اس کی مغرور ناک۔

NEW ERA MAGAZINE .com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

آج اس نے بلیک رنگ کا ڈیزائنر سوٹ پہنا تھا. اس پر اس کے سیدھے سلکی بال جس کو اس نے اونچی پونی میں باندھ رکھا تھا. اس کا قد ذرا لمبا تھا وہ اسمارٹ سی لڑکی پورے ڈیپارٹمنٹ کی توجہ کا مرکز ہوا کرتی تھی۔

ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کی رفتار سست ہو گئی تھی. اسٹوڈنٹس کو اپنے آپ پر لاکھ بھروسہ ہو مگر رزلٹ والے دن خوف ضرور آتا ہے۔

اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب تب ہوئیں جب اس نے ڈیپارٹمنٹ میں

اسٹوڈنٹس کا ہجوم دیکھا جو ٹولیاں بنائے نوٹس بورڈ کے سامنے کھڑے تھے. اس نے ایک سرسری نگاہ سب پر ڈالی اور تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی نوٹس بورڈ کے سامنے آ گئی. اس نے اپنی شہادت کی انگلی لسٹ پر سب سے اوپر لے جا کر رکھی۔

زاویار سکندر!!

اس نے ایک بار نہیں کئی بار یہ نام زیرِ لب دھرایا. حیرانی کے جھٹکے، بے یقینی کا عالم اور سائیں سائیں کرتے لوگ۔

اس نے لسٹ میں اپنا ڈھونڈا۔

علایا ملک! سیکنڈ پوزیشن۔۔۔۔۔

وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹی. اپنے ارد گرد کلاس فیلوز کو دیکھ کر اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس پر ہنس رہے ہوں. وہ جو ہمیشہ سے اول نمبر پر رہی تھی آج قسمت نے اسے دوسرے نمبر پر آنے کا شرف بخشا تھا۔

"اگر قسمت انسان کو بادشاہ بناتی ہے نا تو اگلے لمحے اسے فقیری بھی دکھا دیتی ہے۔"

علایا جو غصے سے بے قابو ہو رہی تھی چند لمحوں میں ڈیپارٹمنٹ سے باہر آ گئی. اس نے اپنے قدموں کا رخ کیفے ٹیریا کی طرف موڑ لیا. اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں اور دل

میں اتنا شور تھا کہ وہ سب کو یہ

شور سنا دینا چاہتی تھی۔

اس کے نزدیک یہ اس کی **پہلی شکست تھی** جو وہ قبول نہیں کر پا رہی تھی۔

کیفے ٹیریا میں پہنچ کر اس نے یہاں وہاں نگاہ دوڑائی تو وہ اسے نظر آ گیا. علایا جانتی تھی کہ وہ اس وقت اپنے دوستوں کے ہمراہ کیفے میں موجود ہوتا ہے. آخر اسے یونی میں چار سال ہو گئے تھے۔

اس نے زاویار کو دیکھا اور تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی اس کے مدمقابل آ کر کھڑی ہو گئی۔

زاویار جو کرسی پر براجمان تھا. اس نے اپنی گہری سنہری آنکھوں سے اسے اپنی طرف آتے دیکھا۔

وہ علایا کو اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کس حد تک ایک بالادستی چاہنے والی کم ظرف لڑکی ہے۔

زاویار اور علایا ہمیشہ سے ہی ایک دوسرے کے مخالف رہے تھے۔

علایا کو اپنے سامنے کھڑا پا کر زاویار اپنی کرسی سے اٹھ گیا۔

کتنے پیسے دے کر سورس لگوائی ہے؟علایا کے اس جملے سے زاویار کو حیرت کے جھٹکے لگے۔

پیسے..سورس..زاویار کو جیسے غصہ آیا تھا۔۔۔ what do you mean?

اوہ سوری..ویسے تمہاری اتنی حیثیت تو ہے نہیں کہ تم کسی کو خرید سکو.وہ تپا دینے والے انداز میں بولی۔

تم سے یہ ہی امید تھی.خرید و فروخت کا کاروبار تم امیر لوگ ہی کر سکتے ہو.میری تو واقعی کوئی حیثیت نہیں ہے.زاویار کو علایا پر شدید غصہ آنے لگا تھ۔ا

شٹ اپ...میں سب جانتی ہوں کہ تم نے کیسے ٹیچرز کے آگے پیچھے گھوم گھوم کہ اور ان کی چاپلوسیاں کر کے اپنے نمبرز بڑھائے ہیں۔

اس بار علایا کی آواز تیز تھی اتنی کہ آس پاس کے لوگوں نے مڑھ کر اسے دیکھا.زاویار کے دوست بھی ٹیبل سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

تم اپنی حد میں رہو علایا.زاویار نے انگلی کے اشارے سے اسے تنبیہ کی۔

اور اگر تم دوسرے نمبر پر آنے کو اپنی ہار سمجھ رہی ہو تو اپنی ہار کو قبول کرو.اس نے ہار پر زور دیا تھا۔

ہار تو میں نے کبھی نہیں مانی زاویار. دو منٹ، صرف دو منٹ نہیں لگیں گے، تمہاری ڈگری ختم کروادوں گی۔اس نے چٹکی بجاتے ہوئے اسے وارن کیا تھا۔

زاویار نے گردن موڑ کر آس پاس دیکھا تو سب اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

"دولت کا غرور اور طاقت کا نشہ بول رہا ہے یہ سب، مگر یاد رہے علایا کہ یہ دو وہ چیزیں ہیں جس نے انسان سے کبھی وفا نہیں کی۔"

اس کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ تھی۔۔۔۔

اور مجھے دھمکانے کے بجائے اپنی پڑھائی پر توجہ دو...اگر تھوڑی اور محنت کرلی ہوتی تو آج یہاں...میرے سامنے نہ کھڑی ہوتیں. وہ معصوم سی شکل بنا کر اسے تپانے والے انداز میں بولا تھا۔

زاویار کے اس جملے پر اس کے دوست بھی ہنس پڑے۔

علایا ملک کے وجود میں غصے کی لہر دوڑ گئی تھی اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی زاویار اس کی بکواس سننے رکا نہیں اس نے کرسی سے اپنا بیگ اٹھایا، ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔

Grades conscious..اونہہ۔۔۔۔۔۔۔

یک لفظ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے دوستوں کے ہمراہ باہر آگیا۔

"کہتے ہیں کہ اگر پہلی شکست سے کچھ سیکھ لیا جائے تو وہ کامیابی کا زینہ بن جاتی ہے۔"

* * * * * * * * *

ملک صاحب پچپن سال کے ادھیڑ عمر آدمی تھے. چہرے اور سر کے بال ہلکے ہلکے سفید تھے، چہرے پر بے جا رعب اور صحت کے لحاظ سے وہ کافی تندرست تھے. ملک صاحب اپنے آفس کے کشادہ سے کمرے میں بیٹھے تھے. انھوں نے اپنے کمرے میں نیم تاریکی کر رکھی تھی. آج ان کے کام کرنے کا کوئی موڈ نہیں تھا. وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے تھے۔

"انسان جب کبھی تنہائی میں بیٹھا ہو تو یقیناً یا تو وہ اپنے ماضی میں کھویا ہوتا ہے یا مستقبل کی پلیننگ کر رہا ہوتا ہے وہ حال میں ہونے کے باوجود بھی حال کی فکر سے آزاد ہوتا ہے. یہ ہی تو انسان کی سب سے بڑی غفلت ہے کہ وہ حال میں جینے کہ بجائے مستقبل کی پرواہ کرتا ہے۔"

ملک صاحب کراچی جیسے بڑے شہر کی ایک جانی مانی شخصیت سمجھے جاتے تھے. ان کی ذہانت ان کی سب سے بڑی کامیابی تھی اور یہی کامیابی ان کی سب سے بڑی طاقت تھی. وہ ملک آف انڈسٹریز کے مالک اور اکیلے وارث تھے. ویسے تو اللہ تعالی اس خاندان

پر شروع سے ہی مہربان رہے تھے. انھیں ہر چیز پلیٹ میں سجی سجائی مل گئی تھی، لیکن کہتے ہیں نا کہ انسان خواہشات کا ڈھیر ہے۔

بزنس میں خوب ترقی کے بعد انھوں نے سیاست میں بھی اپنے قدم مضبوط کر لئے تھے. انھیں سیاست میں ہمیشہ سے ہی دلچسپی رہی تھی. اپنی ذہانت کی بنا پر وہ بہت جلد ہی شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئے تھے اور اب ان کا نام منجھے ہوئے سیاست دانوں میں گنا جاتا تھا۔

"اور سیاست تو ہے ہی کھیل شطرنج کا، منافقت کا۔"

بقول ان کے رقیبوں اور دوستوں کے اس خاندان نے جو چاہا تھا وہ ہمیشہ پایا تھا لیکن جو نظر آتا ہے ویسا کبھی نہیں ہوتا. جب تک دوسرے اپنی تکلیفیں ہم پر عیاں نہیں کر دیتے تب تک ان کی زندگی ہمیں پرفیکٹ ہی نظر آتی ہے۔

ملک صاحب اپنے آفس میں اکثر بیٹھے بیٹھے کھو جاتے، وہ اپنے کام سے جلد اکتا جاتے اور گھر جلدی چلے آتے. یہاں آکر انھیں زندگی کی ایک آس ملتی تھی. وہ علایا کو دیکھ دیکھ کر جیتے۔

علایا کے ان کی زندگی میں آنے کے بعد جیسے ان کی زندگی مکمل ہو گئی تھی. علایا سے ان

کی محبت شدید تھی جس نے علایا کو خود سر، انا پرست اور ضدی بنا دیا تھا. ملک صاحب نے اس کے بچپن سے لے کر آج تک اس کی ہر خواہش کی تکمیل کی تھی اور اگر اس کی کوئی خواہش پوری کرنے میں انھیں ذرا سی بھی دیری ہو جاتی تو وہ آسمان سر پر اٹھا لیتی۔ علایا کی بائیس سالہ زندگی میں ایسی کوئی خواہش نہیں تھی جو پوری نہ کی گئی ہو. علایا سے ان کی محبت اس لئے بھی شدید تھی کہ ان کی اور کوئی اولاد نہ تھی تو علایا ہی ان کی محبت کی اکلوتی حقدار تھی۔

ملک صاحب جانتے تھے کہ وہ کس حد تک جذباتی ہو گئی ہے اور کبھی کبھی تو ان کو اس کے جذباتی پن سے خوف بھی آتا تھا. وہ دوسروں کو اپنے پیر کی جوتی بھی نہیں سمجھتی تھی۔

ملک صاحب جو اپنے خیالوں میں گم تھے کسی خیال کے تحت جیسے حال میں واپس آئے. انھوں نے فوراً ہی ٹیبل پر رکھا اپنا موبائل اٹھایا اور علایا کا نمبر ملایا۔

یکے بعد دیگرے وہ کال پر کال ملائے جا رہے تھے مگر دوسری جانب سے وہی دھاک کے تین پات. ان کی کال موصول نہیں کی جا رہی تھی. کافی دیر بعد جب علایا کی آواز ان کے کان سے ٹکرائی تو انھوں نے سکون کا سانس لیا۔

ڈیڈی!! کین یو بیلیو اٹ؟ (can you believe it)

آپ کی بیٹی علایاملک دوسرے نمبر پر آئی ہے. میرا برسوں کا ریکارڈ ٹوٹ گیا. اس کی آواز سے ہی وہ اندازہ کر سکتے تھے کہ علایا میں آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔

تو کیا ہوا علایا ریکارڈ تو بنتے ہی ٹوٹنے کے لئے ہیں. ملک صاحب نے ایک گہری آہ بھرتے ہوئے کہا۔

* * * * * * * * * *

وہ جو گاڑی میں بیٹھی گاڑی پاگلوں کی طرح یہاں سے وہاں گھما رہی تھی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی اس کا اکیڈمک ریکارڈ بریک کر سکتا ہے، کوئی اس سے آگے بھی نکل سکتا ہے. اسے رہ رہ کر زاویار سے ہونے والی گفتگو یاد آ رہی تھی۔

اس نے جھٹکے سے بریک مارا. اس کو محسوس ہوا کوئی چیز اس کی گاڑی کے نیچے آئی ہے.

اس نے کار کا دروازہ کھولا اور فوراً گاڑی سے اتری۔

ایک چھوٹا سا بلی کا بچہ اس کی گاڑی کے نیچے خون میں لت پت بے جان پڑا تھا۔

بلاڈی فول(bloody fool)۔۔۔۔۔۔

اس نے بے حد اکتائے ہوئے لہجے میں کہا اور واپس گاڑی میں بیٹھ گئی۔

بے مقصد گاڑی یہاں وہاں گھمانے کے بعد اس نے گاڑی اپنے گھر کے رستے میں ڈال

دی. اگلے بیس منٹوں میں وہ اپنے اس خوبصورت محل میں موجود تھی جس کی وہ شہزادی تھی. اپنے وسیع و عریض کمرے میں آکر وہ اپنے بیڈ پر لیٹ گئی. کمرے میں موجود ہر شے چیخ چیخ کر اپنی قیمت کا احساس دلاتی تھی. وہ کوئی معمولی شے استعمال نہیں کرتی تھی. اس کی الماری میں مختلف برینڈز کے کپڑے موجود تھے جو اس نے ایک بار پہن کر دوبارہ پہننے کی زحمت بھی نہیں کی تھی. کمرے کی بیڈ وال پر خوبصورت فریمز لگے تھے جس میں اس کی اپنی تصویریں لگی تھیں۔

کمرے کے سائیڈ میں خوبصورت ریگ بنے تھے جس پہ اس نے بڑی خوبصورتی سے اپنے تمام میڈلز اور ٹرافیز سجائی ہوئی تھیں۔

وہ بیڈ پر لیٹی مسلسل چھت کو گھور رہی تھی. آج زندگی میں پہلی بار اس نے شکست کو محسوس کیا تھا جو وہ قبول نہیں کر سکتی تھی. اس نے زندگی میں کبھی ہارنا نہیں سیکھا تھا۔ میری جگہ پر آنا اتنا آسان نہیں ہے زاویار. اس کی جگہ پر آنا واقعی آسان نہیں تھا۔

* * * * * * * * *

یونیورسٹی سے آنے کے بعد وہ اپنے بیڈ روم میں لیٹا تھا. وہ بھی علایا سے ہونے والی گفتگو بھولا نہیں تھا. اسے اس امیر لڑکی پر شدید غصہ آرہا تھا کیونکہ آج اس نے زاویار کی

سیلف رسپیکٹ مجروح کی تھی. آج یونی کا لاسٹ دے تھا جسے وہ یادگار بنانا چاہتا تھا مگر علایا نے اس کا سارا موڈ خراب کر دیا تھا اس لئے وہ جلدی گھر آ گیا۔

ویسے تو اس کا سارا وقت لائبریری میں گزرتا تھا. وہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ دوستوں کے ساتھ چلے جاتا۔

زاویار سکندر اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا. یہ لوگ کوئٹہ میں رہائش پذیر تھے. اس کا گھر دو منزلہ بنا ہوا تھا جو چھوٹا مگر خوبصورت تھا. زاویار سکندر کے والد سکندر احمد دین اور مذہب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔

زاویار کے والدین نے اس کی پرورش اتنے بہترین انداز میں کی تھی کہ انھیں زاویار پر فخر محسوس ہوتا تھا. وہ بچپن سے ہی دوسروں سے ہمدردی کرنے والا اور نماز وصلوٰہ کا پابند تھا. وہ بچپن سے ہی بڑا ذہین تھا. فارغ وقتوں میں بھی کتابوں کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔

کالج مکمل کرنے کے بعد اس کا اولین مقصد کسی اچھی یونی میں داخلہ لینا تھا. چونکہ کوئٹہ میں تعلیمی ادارے اتنے خاص نہیں تھے تو اس نے کراچی جیسے بڑے شہر میں اپنی تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔

کراچی پہنچ کر اس نے اپنی رہائش کا بندوبست ایک ہاسٹل میں کیا. پورے دو سال ہاسٹل میں رہنے اور وہاں کا بدمزہ کھانا کھانے کے بعد اس کے والد نے اس کے لئے کراچی میں ہی ایک چھوٹا سا فلیٹ خرید لیا۔اس نے اپنے تمام دوستوں کو اپنے بارے میں یہی معلومات فراہم کی تھیں۔

اس کو ہمیشہ سے ہی بزنس میں انٹرسٹ رہا تھا تو اس نے اپنا سبجیکٹ بھی بزنس ہی منتخب کیا. اسے مینجمنٹ کے کام سنبھالنے میں کافی مزہ آتا تھا یونی میں کوئی پراگرام آرگنائیز کرانا ہو تو وہ ہمیشہ آگے ہوتا اس نے یونی میں اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ایک آرگنائیزیشن بنائی تھی جس کا اولین مقصد یتیموں کی مدد کرنا اور مریضوں کا علاج کروانا تھا. وہ ایسا ہی تھا دوسروں پر مہربان، رحم کرنے والا، بہادر اور دیانتدار۔

زاویار کا سب سے اچھا دوست احمر تھا جس کے پاس اپنی بی ایم ڈبلیو گاڑی تھی. زاویار کی ذہانت سے متاثر ہو کر احمر نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا اور چونکہ دوستی انسان کے پیسے اور رتبے کے بجائے اس کے اخلاق اور خلوص سے کی جاتی ہے تو زاویار نے بھی اس کے خلوص کو دیکھتے ہوئے اسکی دوستی قبول کر لی تھی۔

احمر زاویار کے ہر چھوٹے بڑے فیصلے میں اس کا ساتھ دیتا بلکہ اپنی زندگی کے فیصلوں

میں بھی زاویار کی رائے کو ترجیح دیتا۔

آرگنایزیشن بنانے کے فیصلے میں بھی وہ زاویار کے ساتھ آگے آگے تھا. گو کہ احمر میں انسانی ہمدردی کا جذبہ تھا مگر زاویار کے ساتھ رہ کر اس کی یہ انسانی ہمدردی محبت میں بدل گئی تھی. زاویار ایسا ہی تھا جس کے ساتھ ہوتا اسے اپنے سحر میں جکڑ لیتا، اسے پورا بدل دیتا۔

* * * * * * * * * *

دن سے شام اور شام سے رات کب ہوئی اسے پتہ ہی نہیں چلا. اس کی آنکھ کھلی تو وال کلاک نو بجا رہی تھی. وہ جیسے چونک کر اٹھی اتنی دیر تو وہ کبھی نہیں سوئی تھی. وہ جلدی سے بیڈ سے نیچے اتری اور اگلے ۲۵ پچیس منٹوں میں وہ نہا دھو کر بلکل فریش تھی. کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی. اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک خاتون کھڑی تھیں۔

کیا ہوا؟ اس نے برا سا منہ بنایا تھا۔

صاحب آپ کو بلا رہے ہیں بی بی. ان خاتون کی عمر کوئی چالیس برس تھی اور یہ ملک صاحب کی بہت پرانی ملازمہ تھیں۔

آرہی ہوں۔۔۔تم جاؤ۔۔۔اس نے حقارت بھرے لہجے میں بولا۔

زرینہ بی سے وہ ایسے ہی بات کرتی تھی۔ان کا بس چلتا تو کب کا گھر چھوڑ دیتیں مگر ملک صاحب ان کو دگنے پیسے دیتے تھے جس میں ان کو گھر کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ علایا کی بدتمیزیاں بھی برداشت کرنی تھیں۔ویسے تو گھر میں کافی ملازمین موجود تھے مگر ملک صاحب اپنے زیادہ تر کام زرینہ بی سے ہی کرواتے تھے۔

زرینہ بی کو انھوں نے اپنی بیوی کلثوم کے کہنے پر رکھا تھا۔کلثوم کے انتقال کے بعد زرینہ بی نے ان کا خاصا خیال رکھا جس کی وجہ سے انھیں زرینہ بی کی وفاداری پر اعتبار ہو گیا۔

زرینہ بی کے جانے کے بعد وہ کچھ ہی لمحوں میں کمرے سے باہر تھی۔جینز کی پینٹ کے ساتھ شورٹ شرٹ پہنے،بالوں کو اونچے جوڑے میں لپیٹے اور پاؤں میں ہائی ہیلز پہنے وہ اپنے محل کی بالائی منزل پر تھی۔

محل کی ہر شے اتنی خوبصورت تھی کہ کوئی عام آنکھیں دیکھیں تو چکا چوند رہ جائیں۔

جگہ جگہ خوبصورت مجسمے،دیواروں پر دلکش تصاویر،محل کے وسط میں لگا ہوا کانچ کا فانوس،ونڈ چائمز اور مصنوعی پودے غرض ہر چیز سلیقے سے سجی ہوئی تھی۔

وہ سیڑھیوں سے اتر کر سیدھا ڈائننگ حال میں آگئی۔ڈائننگ حال میں بڑی سی کانچ کی ٹیبل کے ساتھ کرسیاں بھی کانچ کی بنی تھیں۔فرش اتنا خوبصورت اور نازک تھا یوں

لگتا تھا کہ علایا کی ہیلز سے وہ بھی ٹوٹ جائے گا۔

ملک صاحب جو ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے تھے علایا کو دیکھتے ہی ان کے چہرے پر مسکراہٹ امڈ آئی۔

ڈیڈی!!اس نے ملک صاحب کے گرد اپنے بازو حائل کر دیئے۔

اب کیا چاہیے آپ کو؟ ملک صاحب نے اسے بڑے پیار سے پوچھا۔

ہاہا۔۔۔۔ڈیڈ۔۔یو گاٹ اٹ۔۔۔۔۔

اس نے اپنے بازو ان کے گرد سے ہٹائے اور بلکل ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

جو مانگوں گی وہ دیں گے؟اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

یہ بتاؤ کہ کیا نہیں دیا تمہیں؟ ملک صاحب نے ٹیبل پر رکھی پلیٹ اپنی طرف کھسکائی۔

کیا کر سکتے ہیں میرے لئے؟اس نے اپنے ہاتھ کو تھوڑی تلے دباتے ہوئے پوچھا۔

ملک صاحب جو ٹرے سے چاول اپنی پلیٹ میں نکال رہے تھے،ان کا ہاتھ وہیں رک گیا.انھوں نے ایک گہری نظر علایا پر ڈالی۔

جان دے سکتا ہوں تمہارے لئے۔

اُففف!!!یہ کہہ کر علایا نے اپنا سر پکڑا تھا۔

ڈیڈی یہ گھسے پٹے ڈائیلاگ فلموں میں اور ڈراموں میں ہی بولے جاتے ہیں. وہ مذاق اڑاتے ہوئے بولی۔

اب یہ تو کسی کتاب میں نہیں لکھا ویسے. انھوں نے شرارتی انداز میں کہا۔

ڈیڈ!!....میں چاہتی ہوں کہ آپ دوسری شادی کر لیں. وہ تیزی سے بولی۔

کک..کک...کیا..وہ حیرانی سے بولے. لفظ ان کی زبان سے ادا نہیں ہو پا رہے تھے۔

* * * * * * * * *

یہ سردیوں کہ دن تھے اور جنوری کا مہینہ تھا. آج موسم صبح سے ہی حسین رہا تھا. آسمان پر کالے بادلوں کا ڈیرہ تھا یوں لگتا تھا کہ کسی بھی وقت برس جائیں گے۔

علایا نے جینز کے ساتھ کالے رنگ کی شرٹ پہنی تھی اس کے اوپر اس نے لال رنگ کا لانگ کوٹ لے رکھا تھا. اپنے سیاہ سلکی بال اس نے سائیڈ کی مانگ نکال کر آگے کندھے پر گرا رکھے تھے. ہوا کے جھونکوں سے اس کے بال اس کے چہرے پر جھول رہے تھے. پاؤں میں کالے رنگ کے حسین جو گرز پہنے وہ اپنے محل کے لان میں موجود تھی اور اس حسین موسم کے سحر میں جکڑی وہ آسمان کو دیکھ رہی تھی. جب ہی موبائل کی گھنٹی نے اس سحر کو توڑا۔

ایمن کالنگ...اس نے فوراً ہی کال پک کر لی تھی۔

میں ابھی تمہیں ہی یاد کر رہی تھی. وہ موبائل کان سے لگاتے ہوئے بولی۔

یاد ہی کرنا، کال نہ کرنا. ایمن نے دبے دبے غصے سے کہا۔

تمہیں پتہ تو ہے میرا موڈ کتنا خراب تھا. اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

جانتی ہوں. اسی لئے تو تم سے ملنے آئی ہوں۔

کیا مطلب؟ ویٹ.. تم پاکستان آگئی ہو؟ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

یس میڈم. آپ اپنے محل سے نکلیں تو آپکو اندازہ ہو کہ باہر کون آپ کا انتظار کر رہا ہے۔

NEW ERA MAGAZINE .com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

کیا.. تم باہر کھڑی ہو. یہ کہہ کہ اس نے اپنے پیروں کا رخ مین گیٹ کی طرف موڑ لیا۔

وہ تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی باہر آئی تو بلیک رنگ کی اس بڑی سی گاڑی میں اس کی دوست ایمن بیٹھی تھی۔

علایا کسی سے اتنی ملنے جلنے والی نہ تھی مگر یونی میں اس کی چند دو تین ہی دوستیں تھیں.

ایمن، ملک صاحب کے ایک دوست کی بیٹی تھی جو کافی پیسے والے تھے اور علایا نے اس سے دوستی کرتے وقت اس کا حسب نصب ہی دیکھا تھا۔

حسب نصب دیکھ کر تو شادیاں ہوتی ہیں، دوستیاں تو یونہی ہو جایا کرتی ہیں لمحوں"

"میں۔

ہیلو سویٹی!!

علایا کے باہر آتے ہی وہ گاڑی سے باہر آئی۔

کیسا رہا ورلڈ ٹور؟ علایا اس سے گلے مل کر بولی۔

امیزنگ رہا..بہت مزہ آیا. وہ ایک دم ہی خوشی سے بولی۔

باقی باتیں گاڑی میں کریں گے تم جلدی سے گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔

ایمن نے تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا اور فوراً سیٹ پر بیٹھ گئی۔

علایا نے چند لمحے سوچا پھر وہ بھی گاڑی میں بیٹھ گئی. اس کا موڈ کافی دنوں سے بہت خراب رہا تھا. وہ زاویار سے انتقام کی آگ میں جل رہی تھی. اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی ایمن نے جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کی اور گاڑی زن سے آگے بڑھ گئی۔

* * * * * * * *

تو کیا ہوا یار؟ تم چلاؤ یا میں، بات تو ایک ہی ہے. کافی دیر سے احمر زاویار کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر زاویار کے کان پر جوں بھی نہیں رینگ رہی تھی۔

میں نہیں چلاؤں گا. اس نے اپنی گردن دائیں سے بائیں جانب موڑی۔

وہ دونوں ایک کیفے میں بیٹھے تھے. یونی ختم ہو گئی تھی لیکن ان کا ملنا ختم نہیں ہوا تھا. وہ روز کسی نہ کسی بہانے مل لیتے تھے اور آج تو موسم بھی کافی حسین تھا۔

زاوی! میرے بھائی. اس میں کیا برائی ہے؟ اس بار احمر نے بڑے پیار سے بولا. احمر زاویار کو پیار سے زاوی کہتا تھا. بقول احمر کے زاویار کافی بڑا نام تھا تو زاوی کہنے سے اس کے کچھ سیکنڈز بچ

جاتے جو اس کے لئے بے حد قیمتی تھے۔

انسان کے پاس جو سب سے قیمتی دولت ہے نا وہ وقت کی دولت ہے. وقت نے ہی تو انسان کو اس کے مختلف کرداروں سے ملوایا ہے. انسان نے وقت کے شکنجوں سے گزرتے ہوئے کبھی بچپن کے خوبصورت دن دیکھے، جس میں آس پاس ہر کوئی محبت کرنے والا ہوتا ہے تو کبھی جوانی دیکھی، جس میں لوگوں کی تلخ باتیں اور سرد رویے صدیوں تک کے لئے لوگوں کے ذہنوں پر ایک گہرا اثر چھوڑ جاتے ہیں جو انسان شاید مرتے وقت بھی نہیں بھولتا، پھر لڑکپن جس میں وہ اپنے عزیز رشتوں سے بچھڑنا شروع ہو جاتا ہے، اولاد کا دکھ جھیلتا ہے اور سب سے آخری مہلت وقت کی تب ملتی

ہے جب انسان بڑھاپے کو پہنچ جاتا ہے تب احساس ہوتا ہے کہ اس نے کیا کھویا اور کیا پایا، وقت کیسا بھی ہو چاہے اچھا یا برا گزر جاتا ہے۔

برائی کچھ نہیں ہے احمر. لیکن جب میرے پاس گاڑی ہے ہی نہیں تو سیکھنے کی کیا ضرورت. زاویار نے اسے سمجھانے والے انداز میں بولا۔

تو کیا ہوا اگر گاڑی نہیں ہے، یہ اسکل تو سب کو آنی چاہیے۔

زاویار کو احمر نے کافی بار ڈرائیونگ سیکھنے کا کہا تھا مگر ہر بار وہ یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ مجھے کوئی انٹرسٹ نہیں. آج احمر کے بہت زیادہ سمجھانے پر اس نے جیسے ہار مان لی تھی اور وہ کافی دیر کی ضد بحث کے بعد گاڑی سیکھنے پر راضی ہو گیا۔

یہ ہوئی نا میرے بھائی والی بات. احمر نے زاویار کے کندھے پر ایک زوردار تھپکی دی۔

تو آپ کی ٹریننگ آج سے ہی شروع کی جاتی ہے. احمر جلدی سے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا. زاویار بھی اسی کے ساتھ اٹھ گیا. وہ دونوں تیزی سے کیفے سے باہر آ گئے۔

احمر نے جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا اور زاویار کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ گاڑی میں بیٹھ گیا. احمر بھی گاڑی میں بیٹھا اور چابی زاویار کی طرف بڑھا دی۔

زاویار نے اگنیشن میں چابی گھمائی تو اگلے ہی لمحے گاڑی اسٹارٹ ہو گئی تھی۔

* * * * * * * * *

اس نے گاڑی چلانا شروع کی تو احمر نے اسے سمجھانا شروع کر دیا. اسٹیئرنگ ویل کو اس نے آہستہ آہستہ گھمایا اور گلی کا موڑ کاٹا۔

ویری گڈ! احمر نے اسے شاباشی دیتے ہوئے کہا۔

دس منٹ تک اس نے گاڑی بہت آہستہ چلائی پھر اس نے سپیڈ آہستہ آہستہ بڑھانی شروع کی۔

اوہ...اوہ..یہ کیا کر رہا ہے؟ گاڑی کی اسپیڈ اب کافی تیز ہو گئی تھی تو احمر کافی خوف زدہ ہو گیا۔

NEW ERA MAGAZINE .com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

سپیڈ کم کر یار، سپیڈ کم کر. احمر جلدی سے بولا۔

نہیں ہو رہی. وہ گھبرایا تھا۔

اوئے میں اتنی جلدی مرنا نہیں چاہتا، ابھی تو شادی بھی نہیں ہوئی میری۔

اوہ گاڈ!! زاوی گاڑی سائیڈ پر لگا لے یہ نہ ہو کہ کوئی گاڑی کے نیچے آجائے یا ہماری گاڑی کسی کے نیچے آجائے۔

اس کے چہرے کے اڑتے رنگ دیکھ کر زاویار کی ہنسی نکلی۔

اگلے ہی لمحے میں اس نے گاڑی روکی اور اسے شرارت بھری نظروں سے دیکھا۔

ڈرپوک، بزدل۔۔۔۔۔اس کے چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ آئی۔

تجھے گاڑی چلانا آتی ہے اور تو نے مجھے اتنے ٹائم تک پاگل بنایا۔۔وہ خفا ہوتے ہوئے بولا۔

کوئٹہ میں گاڑی تھی تو چلا لیتا تھا، یہاں ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔وہ کندھے اچکا کے بولا۔

خیر چھوڑو یہ بتاؤ کہاں جانا پسند کرو گے اس ڈرائیور کے ساتھ؟زاویار کے اس انداز پر احمر مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔

امم۔۔سمندر پر چلیں؟احمر نے سوچتے ہوئے کہا۔

چلو وہیں چلتے ہیں۔زاویار نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھاتے ہوئے کہا اور گاڑی زن سے بھگاتا ہوا لے گیا۔

* * * * * * * * *

ملک صاحب آج اپنے محل کے کمرے میں آرام فرما رہے تھے۔ان کا آج آفس جانے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔ان کی نظریں سامنے چلتے ہوئے ٹی وی پر ٹکی ہوئی تھیں مگر وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔وہ کئی لمحے اسکرین پر چلتی ہوئی خبروں کو دیکھتے رہے

مگر ان کا ذہن تو کہیں اور الجھا ہوا تھا. انھوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑا. ان کا ذہن آہستہ آہستہ ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔

زرینہ بی!! انھوں نے کانپتی ہوئی آواز سے زرینہ بی کو پکارا اور زرینہ بی تو ویسے ہی ہر لمحے ملک صاحب کے آگے پیچھے گھوم گھوم کے ان کی خدمتیں کرتی پوری ہو گئی تھیں۔

زرینہ بی جلدی سے کمرے میں آئیں اور بیڈ کے برابر میں ٹیبل پر پڑی چابیاں اٹھائیں اور جلدی سے الماری کا دروازہ کھول کر ان کی دوائی کا ڈبہ نکالا۔

ملک صاحب کی حالت کافی غیر ہو رہی تھی مگر زرینہ بی بھی کام کی پکی لگتی تھیں. انھوں نے ٹیبلیٹ نکالی اور ان کے ہاتھ میں تھمادی پھر تیزی سے پانی کا گلاس بھر کر ان کے منہ سے لگا دیا. کچھ ہی دیر میں وہ بلکل نارمل ہو گئے تھے۔

* * * * * * * *

شام کے سائے ڈھلنے لگے تو ٹھنڈی ٹھار برف جیسی سردی بھی بڑھنے لگی. جیسے جیسے رات اندھیر ہوئی تو ان کا دل بھی تاریکی میں ڈوبنے لگا. اس کمرے کا موسم باہر کے موسم سے کافی گرم تھا. انھوں نے کمرے کا ہیٹر آن کر رکھا تھا. کمرے کے کونے پر رکھا ہوا کانچ کا خوبصورت لیمپ جس کی جلتی ہوئی ہلکی جامنی روشنی انھیں تقویت دے

رہی تھی۔

کمرے کے کونے میں شاہ بلوط کے درخت کی لکڑی سے تیار کردہ عمدہ راکنگ چیئر رکھی تھی جو کافی اونچی اور کسی شاہی محل میں رکھی ہوئی کرسی جیسی خوبصورت تھی جو آہستہ آہستہ جھول رہی تھی، یقیناً ملک صاحب ابھی وہیں سے اٹھے تھے۔

کمرے میں مکمل خاموشی تھی. بلکل ویسی خاموشی جو طوفان سے پہلے ہوتی ہے، وہی خاموشی جو رات کی تاریکی میں ہوتی ہے، وہی خاموشی جو بولنے سے پہلے ہوتی ہے اور وہی خاموشی جو موت کے بعد ہوتی ہے۔

وہ اس وقت سادہ سے شلوار قمیض میں ملبوث اپنے وسیع و عریض کمرے کی قد آور کھڑکیوں کے پاس کھڑے تھے. بند شیشوں میں بھی وہ اس پار دیکھ سکتے تھے جہاں اونچے اونچے درختوں کے سائے انھیں ہلتے ہوئے معلوم ہوتے تھے. ان کی نظر یونہی رینگتی ہوئی سامنے بنے پارک کے سامنے ٹھہر گئی. دن کی روشنی میں چمکنے والا یہ خوبصورت پارک اندھیر نگری بنا ہوا تھا۔

جبھی ان کے تسلسل سوچ میں ڈوبے چہرے کے سامنے علایا کا چہرہ لہرایا. درخت کے سائے میں علایا کا چہرہ بننے لگا تھا. یہ وہ ضدی، مغرور اور انا پرست علایا نہیں تھی. یہ تو

کوئی پیاری سی، معصوم سی اور سکون سے رہنے والی چھوٹی سی علایا تھی جو شاید کچھ دن کی معلوم ہوتی تھی۔

وہ ملک صاحب کی گود میں تھی اور ملک صاحب نے اسے اپنے سینے سے لگایا ہوا تھا.

شاید یہ اس کی ماں سے بچھڑ جانے کے بعد کا منظر تھا۔

پھر اگلے ہی لمحے ان کے سامنے تقریباً ایک سال کی بچی کا چہرہ آیا. وہ علایا تھی، چھوٹے سے بلاؤز کے ساتھ لال رنگ کا شرارہ پہنے، بالوں میں دو پونیاں باندھے، قدم قدم ان کی طرف دوڑتی آرہی تھی. ان کے کانوں میں اس کی ہنسی گونجی تھی. انھوں نے اس پیاری اور معصوم علایا کو گود میں اٹھایا اور اس کے گال باری باری چومے۔

اب وہ علایا انھیں پانچ سال کی نظر آئی جو گارڈن میں اداس اور تنہا بیٹھی تھی. زرینہ بی نے اس کے سامنے نا جانے کتنی ہی چیزیں رکھی تھیں مگر وہ بضد تھی کہ ڈیڈ آئیں گے تو ہی وہ ان چیزوں میں سے کچھ کھائے گی۔

ملک صاحب کو یاد تھا کہ ان کے آفس سے آتے ہی اس نے دور سے انھیں دیکھ کر دوڑ لگائی تھی. ملک صاحب نے اس پانچ سال کی بچی کو اپنی گود میں بھر لیا تھا۔

ڈیڈ... میں نے اب تک کچھ نہیں کھایا... اس کے چہرے پر صرف اور صرف معصومیت تھی۔

کیوں علایا؟ دنیا کو اپنے گھٹنوں پر لانے والے علایا کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھے تھے۔

مجھے کھانا آپ کے ساتھ کھانا ہے.. وہ بڑی بڑی پلکیں جھپکا کر بولی تو وہ اسے دیکھ کر رہ گئے۔

ڈیڈ.. اللہ تعالی نے مجھے مما کیوں نہیں دی؟ میں بہت اکیلی ہوں... سب بچوں کی مما کھانا کھلاتی ہیں اور.. مجھے زرینہ بی کے گندے ہاتھوں سے بنا ہوا کھانا کھانا پڑتا ہے. اس کی بھوری آنکھیں روئی تھیں. موٹے موٹے آنسوؤں کی رم جھم نے اس کا سنہری رنگت والا چہرہ گیلا کر دیا تھا۔

ملک صاحب نے اس کے آنسو پونچھے اور اسے گلے سے لگایا اور اسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلایا۔

موبائل کی گھنٹی سے یکدم ہی ان کی آنکھوں کے سامنے لہرانے والا ماضی دھندلانے لگا تھا۔

انھوں نے گردن موڑی تو بیڈ پر ان کا موبائل بج رہا تھا۔

وہ قدم قدم بڑھتے ہوئے بیڈ تک آئے اور موبائل اپنے ہاتھ میں تھاما۔

Z.S calling....

ان کا پورا وجود یکدم ہی شل پڑنے لگا. انھیں اس گرم کمرے میں ٹھنڈے پسینے آئے

تھے. وہ پتھر کا مجسمہ بنے اس نام کو دھرائے جا رہے تھے. یہ کون تھا جس سے انھیں اتنا خوف آیا تھا؟

تھوڑی ہی دیر میں کمرے میں وہی سناٹا چھا گیا. ملک صاحب کے سانس لینے کی آواز بھی اب سنائی نہیں دیتی تھی. ان کے دل و دماغ میں خوف کے گھنٹے بجنے لگے تھے۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پھر سے موبائل نے شور مچایا تو ملک صاحب کے دل کی دھڑکنیں بڑھ گئیں. انھوں نے ڈھیر ساری ہمت جمع کر کے موبائل آنکھوں کے سامنے کیا۔

پرویز کالنگ۔۔۔۔۔

NEW ERA MAGAZINE .com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

پہلے والی گھبراہٹ آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی. انھوں نے ایک گہری سانس لی پھر کال پک کرتے ہوئے موبائل کان سے لگایا۔

کیا ہوا پرویز؟ اتنی رات کو کال کی ہے؟ سب ٹھیک ہے؟ وہ نارمل سے انداز میں پوچھ رہے تھے۔

کچھ لمحوں تک یونہی خاموشی رہی شاید وہ کچھ بتا رہا تھا۔

اچھا.. پھر؟ ان کی تیوریوں میں بل آئے تھے۔

پھر لمبی خاموشی رہی... نا جانے کیا بات ہو رہی تھی؟

جاپان کا دورہ؟ وہ مبہوت لہجے میں بولے۔

نا میں جاپان جانا چاہتا ہوں... نا میں کسی کو بھیجوں گا. یہ فارم فل کرنے کی ضرورت نہیں. ملک صاحب سپاٹ سے لہجے میں بولے اور لائن کٹ کر دی. انھوں نے موبائل کو بیڈ پر تقریباً پٹخا تھا۔

وہ پہلے ہی ایک ٹینشن میں مبتلا تھے اور اب وہ مزید ایک نئی پریشانی کو سر نہیں لینا چاہتے تھے

مگر کون جانے کہ یہ جاپان کا دورہ کس کا انتظار کر رہا تھا؟ کون جانے کہ سمندروں پار اس جاپان میں کیا راز ہو؟ کون جانے کہ شاید ملک صاحب کا ماضی بھی جاپان سے جڑا ہو؟ کون جانے؟؟؟؟؟

* * * * * * * * *

کافی دیر گاڑی میں یہاں وہاں گھومنے کے بعد ڈرائیونگ پوزیشن علایا نے سنبھال لی. تھی

آگے کا کیا پلان ہے علایا؟ ایمن جو کافی دیر سے ونڈو اسکرین کے باہر دیکھ رہی تھی یکدم ہی کچھ یاد آنے پر علایا سے پوچھا۔

تمہیں پتہ ہے نا کہ میں پلیننگ نہیں کرتی. وہ برا سا منہ بنا کے بولی۔.

گاڑی کو اس نے ٦٠ کی اسپیڈ پر چلایا ہوا تھا. اپنے لمبے کھلے بالوں کو اس نے اب اونچے اور ڈھیلے سے جوڑے میں باندھ لیا اور ایک لمبی لٹ جو سائیڈ کی مانگ سے اس کے چہرے کے بوسے لے رہی تھی. سردی سے اس کی ناک اور چہرہ گلابی پڑ رہا تھا جس سے اس کی کشش میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

مگر علایا مجھے لگتا ہے کہ پلیننگ سے چلنے والے اپنے مقصد میں جلدی کامیاب ہوتے ہیں. اس نے یونہی علایا کو دیکھتے ہوئے کہا جس کا دھیان صرف گاڑی چلانے پر مرکوز تھا۔" مجھے لگتا ہے کہ

پلیننگ سے چلنے والے اچانک فیصلے کرنے سے ڈر جاتے ہیں. ہر وقت پلیننگ کرنے والے کبھی ڈسیجن ٹیکر نہیں بن پاتے۔

اس نے اس انداز میں کہا کہ ایمن چند لمحے کچھ بول نہ سکی۔

گاڑی کے شیشے بند تھے مگر پھر بھی سردی نے اپنے ہونے کا پورا احساس دلایا ہوا تھا۔

تو پھر تم نے کیا فیصلہ کیا؟ کچھ لمحوں کی خاموشی کہ بعد ایمن نے پھر وہی بات پوچھنا چاہی۔

بات کا مقصد وہی تھا بس لفظ بدل گئے تھے۔

کس بارے میں؟

اس خواب کے بارے میں جو تم نے مجھے سنایا تھا. یاد ہے نا تمہیں وہ خواب؟

علایا نے پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھا پھر گردن سیدھی کرتے ہوئے ایک گہری آہ بھری۔

حسین گلابی چہرے پر یکدم ہی مایوسی چھائی تو گاڑی کے شیشے پر بھی ہلکی ہلکی دھند چھانے لگی. یکدم ہی دل بوجھل سا ہو گیا. کچھ لمحے تو وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

یاد ہے.. میں کیسے بھول سکتی ہوں؟ وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

اس کی گاڑی کلفٹن کے اس چوڑے روڈ پر چل رہی تھی جہاں سے سمندر واضح نظر آتا تھا۔

ہم کافی ٹائم بعد یہاں ساتھ آئے ہیں. ایمن نے اپنی طرف کی ونڈو اسکرین سے دور سمندر کی لہروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

علایا نے کوئی جواب نہ دیا۔

* * * * * * * * *

اس نے موت کو بلکل اپنی آنکھوں کے سامنے محسوس کیا تھا. دہشت سے اس کی سانسیں اس کے حلق میں اٹک گئی تھیں. وہ شش و پنج میں مبتلا تھا نہ سانس لے پاتا تھا، نہ جان نکل پاتی تھی. خوف کے مارے اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی ہو گئی تھیں. وہ چلانا چاہتا تھا....وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا....وہ مرنا نہیں چاہتا تھا...وہ مرنا نہیں چاہتا تھا...وہ ابھی اور جینا چاہتا تھا۔

کمرے میں نیم تاریکی کے بعد بھی وہ اس شخص کو اچھی طرح پہچانتا تھا کہ وہ کون تھا؟ وہ اس سے ملنے کیوں آتا تھا؟ وہ اس سے کیا چاہتا تھا؟

دنیا میں انسان دو لوگوں کو کبھی نہیں بھولتا ایک وہ جس نے آپ کو حد سے بڑھ کر اذیت دی ہو اور دوسرا وہ جس سے آپ نے سب سے زیادہ محبت کی ہو۔

تم زندگی سے کیوں گھبراتے ہو؟ اس کے کانوں میں دور سے اس کی آواز آئی تھی۔

زندگی خواب دکھاتی ہے...اس کے دل سے یہ آواز آئی البتہ لفظ اس کی زبان سے ادا نہیں ہوئے تھے۔

تو پھر موت سے کیوں ڈرتے ہو؟ یوں لگتا تھا کہ اس نے اس کا جواب سن لیا اور اس نے

اپنی سرخ پڑتی آنکھوں سے اب اگلا سوال پوچھا تھا۔

موت سے سب ڈرتے ہیں... وہ خوف اور بے بسی کے ملے جلے تاثرات سے بولا۔

ایک عجیب سی کیفیت اس پر طاری ہوئی تھی۔

موت سے وہ ڈرتے ہیں جو گناہ کرتے ہیں... تم نے گناہ کیا ہے.. جس کے لئے میں تمہیں قیامت تک معاف نہیں کروں گا.. وہ زور سے دھاڑا تھا۔۔

میں نے کوئی گناہ نہیں کیا... میں نے تمہیں نہیں مارا... میں نے تمہیں نہیں مارا...

اس کی آواز میں بے بسی تھی... اگلے ہی لمحوں میں وہ سایہ دھوئیں کی طرح ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

NEW ERA MAGAZINE .com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

* * * * * * * * * *

علایا جو گاڑی میں بیٹھی گاڑی آہستہ آہستہ چلا رہی تھی، ذرا سا آگے اسے پارکنگ نظر آ گئی. اس نے تیزی سے گاڑی اپنی منزل کی جانب بڑھائی تھی کہ اچانک ایک بی ایم ڈبلیو نے اس خالی جگہ پر اپنا وار کیا. علایا کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی.. اس نے گاڑی میں بیٹھے ہی تیز تیز ہارن دینا شروع کیا۔

گاڑی میں بیٹھے لڑکے کافی ہوشیار تھے. علایا کے لاکھ ہارن دینے کے بعد بھی وہ دونوں

گاڑی سے باہر آ گئے۔

زاویار نے ذرا اسٹائل سے اپنے بالوں میں فنگر کامب کیا. اس نے موٹی جینز کے ساتھ کالے رنگ کی شرٹ پہنی تھی جس پر براؤن رنگ کی جیکٹ پہنی تھی. گہری بھوری جھیل سی آنکھوں میں کچھ تھا جو کوئی پڑھ ہی نہیں پاتا تھا. وہ ہینڈسم تھا مگر علایا کی طرح اپنی خوبصورتی پر غرور نہیں کرتا تھا۔

"اور ویسے بھی جن باتوں پر انسان کا اختیار نہ ہو ان باتوں پر غرور کیا کرنا؟ "

وہ تو ہمیشہ سے ہی ایسا تھا.. پہلی نظر میں بھا جانے والا خوبصورت مرد.. نا جانے علایا اس سے کیوں چڑتی تھی؟

NEW ERA MAGAZINE .com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

احمر کو تو شک تھا کہ علایا زاویار کی خوبصورتی سے بھی جلتی ہے. اس نے یہ بات زاویار کے کان میں بھی ڈال دی تھی جو اسے بڑی بھلی معلوم ہوئی تھی... اور اسے احمر کی عقلمندی پر خاصی حیرانی بھی ہوئی تھی. احمر اور عقلمند؟؟ ہونہہ.. خیر چھوڑو... زاویار کے گاڑی سے نکلتے ہی ایک دلکش مہک ہوا میں تحلیل ہوئی تھی۔۔۔ اس نے سمندر کی ٹھنڈی ٹھار ہوا اپنے اندر کھینچی تو دھیمی دھیمی مہک بھی نتھنوں سے ٹکرائی۔

احمر بھی اس کے ساتھ کھڑا کافی پیار الگ رہا تھا. بال جیل سے پیچھے کئے.. جیکٹ میں ہاتھ ڈالے وہ گھوم کر اس کی طرف آیا. وہ گاڑی لاک کر کے پلٹا تو احمر اور وہ پیدل چلنے

لگے. ہارن کی آواز تو انھوں نے ان سنی کر دی تھی۔

چونکہ سردیوں میں سمندر پر کم ہی لوگ آتے ہیں اس لئے زیادہ لوگ نظر نہیں آتے تھے... یہ لوگ ابھی سمندر سے اوپر روڈ پر تھے لیکن اوپر ہونے باعث یہاں سے سمندر کا نظارہ بڑی آسانی سے کیا جا سکتا تھا.. روڈ پر بنی منڈیر پر کچھ کپلز بھی بیٹھے نظر آرہے تھے.. جو اپنی باتوں میں مشغول تھے۔۔

نیچے سمندر جب پتھروں سے سر پیٹتا تو پانی ہوا کے ساتھ اچھل کر منڈیر تک آتا تھا۔

وہ دونوں قدم قدم بڑھاتے ہوئے سہانے موسم کا مزہ لے رہے تھے۔

علایا اور ایمن ان دونوں کو اچھی طرح پہچان گئی تھیں ہاں مگر ان دونوں نے انھیں نہیں دیکھا تھا۔

علایا کا دماغ زاویار کی شکل دیکھتے ہی خراب ہوا تھا یا اسے پھر کوئی نیا دورہ پڑا تھا... ایمن نے اس کے تاثرات کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

اگلے ہی لمحوں میں ایمن نے علایا کو گاڑی سے باہر جاتے دیکھا تو وہ بھی فوراً ہی باہر آ گئی۔

شام کا گہرا منظر تھا.. مغرب ہونے میں ابھی تقریباً آدھا گھنٹا باقی تھا. مگر چونکہ موسم کالے بادلوں کے زیرِ اثر تھا تو اس لئے انھیں مغرب کا منظر ہی لگ رہا تھا. سورج بھی بادلوں کے پیچھے چھپا انھیں دیکھ رہا تھا۔۔

زاویار۔۔۔!!

اس نے اتنی زور سے آواز لگائی تھی کہ اتنے شور میں بھی زاویار کے کانوں سے اس کی آواز ٹکرائی تھی۔اسے یہ محض ایک وہم لگا تھا... سمندر پر آتے ہی عجیب سے خیال نے اسے جکڑا.. بھلا علایا اس کا نام سمندر پر آکر کیوں پکارنے لگی؟؟اس نے اپنا سر جھٹکا۔

احمر مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ علایا کہیں آس پاس ہے....زاویار نے تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے احمر سے کہا۔

تجھے ڈر لگتا ہے نا اس سے؟؟احمر نے فوراً سے چھیڑا تھا.اس کی آنکھوں میں شرارت اتر آئی تھی..ویسے لوگوں کو فائیلو فوبیا"کسی کی محبت میں گرفتار ہو جانے کا ڈر"ہوتا ہے یا اوٹو فوبیا"اکیلے رہ جانے کا ڈر"ہوتا ہے،مجھے لگتا ہے تجھے علایا فوبیا ہو گیا ہے..اس نے کسی شیطان بچے کی طرح مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر شرارت بھری تھپکی دی۔

میں اس سے ڈرتا نہیں ہوں..بس وہ بے ادب ہے میں اس کا ادب کرتا ہوں۔زاویار نے فوراً اسے ٹوکا تھا۔

زاویار اسے کئی بار یہ بات بتا چکا تھا مگر احمر اسے علایا کے نام سے ہی چھیڑتا تھا اور سب سے خاص بات جو احمر نے زاویار کو نوٹ کروائی تھی وہ یہ کہ علایا کی آنکھیں زاویار سکندر سے ملتی ہیں۔۔۔اور یہی نہیں پوری کلاس میں احمر نے یہ بات مشہور کر دی تھی۔۔۔

زاویار!!

ایک بار پھر وہی آواز اس کے کان سے ٹکرائی تھی اور اب یہ آواز کافی قریب تھی اتنی کہ احمر پلٹے بغیر نہ رہ سکا. اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی تھیں. زاویار بھی پلٹا تو وہ بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

سمندر کے نیلے پانی سے ہوتی ہوئی تیز ہوا ان سے ٹکرائی تو انھیں جیسے سردی کا احساس ہوا۔۔

اب وہ چاروں ایک دوسرے کے مدمقابل تھے۔

علایا نے اپنی بڑی بڑی پلکیں اٹھا کر زاویار کو دیکھا. وہ نارمل لگ رہی تھی مگر علایا جانتی تھی کہ وہ نارمل نہیں تھی۔

زاویار کو وہ ایک معصوم سی شہزادی لگی تھی.. لال رنگ کا لانگ کوٹ اس پر کافی پیارا

لگ رہا.. لیکن اسے فوراً ہی یاد آیا تھا کہ علایا شہزادی تو ہے مگر معصوم نہیں ہے۔۔

احمر کو تو وہ کوئی شیطان معلوم ہوئی تھی۔

Think about devil and devil is here.

"شیطان کا نام لیا اور شیطان حاضر۔"

احمر اپنی پیاری سی چھوٹی سی آنکھوں کو گول گھماتے ہوئے بڑبڑایا.. جس کی آواز زاویار کے کانوں تک آرام سے پہنچی تھی۔

زاویار سکندر!! کیا تم نے قسم کھا رکھی ہے ہر اس جگہ قبضہ کرنے کی جس پر میری نظر ہوتی ہے؟ علایا نے اپنے ہاتھوں کو سینے پر بل دیتے ہوئے پوچھا۔

اب وہ اسے شہزادی بھی نہیں لگی تھی.. وہ تو وہی کامپلیکسڈ سی لڑکی تھی جس پر صرف ترس ہی کھایا جا سکتا ہے۔ پھر وہ کیوں اس سے امید لگاتا تھا؟

زاویار کے لبوں پر بلاوجہ کی مسکراہٹ امڈ آئی. اس نے ایک نظر احمر کو دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

لگتا ہے یہ ابھی تک اس فیز سے باہر نہیں آئی ہے. احمر اس کے اس جملے پر ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔

علایا کے تو جیسے احمر کی ہنسی سر پر لگی اور تلوؤں پر بجھی۔

وہ لوگ آس پاس کے گزرتے ہوئے لوگوں سے بلکل بے نیاز ہو گئے تھے۔

ایمن!! ملک صاحب سے کہہ کر اس کا علاج کراؤ. ایسا نہ ہو کہ یہ ڈپریشن کی مریضہ بن جائے. احمر جلتے میں تیل ڈالنا نہیں بھولا تھا۔

فضول بکواس بند کرو اور گاڑی ہٹاؤ یہاں سے.. ورنہ اینٹ مار کے تمہاری گاڑی کے سارے شیشے توڑ دوں گی... پھر تمہیں پتہ چل جائے گا کہ ڈپریشن کی اصل مریضہ کیسی ہوتی ہے.. وہ خونخوار لہجے میں بولی۔

سمندر کی ٹھنڈی ہواؤں میں یکدم ہی ماحول کافی گرم ہو گیا تھا۔

علایا!! ایمن نے اس کے بھڑکتے ہوئے غصے کو کم کرنا چاہا۔

او نہوں.. تم چپ رہو.. علایا نے ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوکا۔

زاویار کے ماتھے پر بل پڑے تھے... وہ چھوٹی چھوٹی آنکھیں کے اُسے دیکھ رہا تھا۔

پہلی بات علایا، یہ جگہ آپ کی ملکیت نہیں، دوسری بات کوئی جگہ صرف دیکھنے سے آپ کی نہیں ہو جاتی، اسے حاصل کرنا پڑتا ہے۔

زاویار نے اسی کے لہجے میں اسے جواب دیا تھا۔

ملک صاحب کی بیٹی علایا ملک سے زاویار کی ہمت بھی کیسے ہو سکتی تھی بھلا ایسے بات کرنے کی؟ کیا یہ ملک صاحب سے ڈرتا نہیں؟ ایمن عجیب خیالوں میں کھو گئی۔

علایا، جس نے بلاوجہ معمولی سی بات پر یہ ہنگامہ مچایا ہوا تھا، زاویار کے اس جواب نے اس کے غصے کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو ہوا دی تھی۔

عجیب...اسے شاید زاویار سے لڑنے میں مزہ آتا ہے...احمر نے سوچا تھا...بولنے کی ہمت کہاں تھی۔۔

آس پاس سے گزرتے ہوئے لوگ بھی رک کر انھیں دیکھ لیتے مگر علایا کہاں کسی کو دیکھنے والی تھی۔۔

NEW ERA MAGAZINE .com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

اگر پہلا قتل معاف ہوتا تو تم سب سے پہلے میرے ہاتھ سے قتل ہوتے. وہ چبا چبا کر بولی۔

علایا عجیب وحشی بن گئی تھی۔۔۔انٹرسٹنگ...تم امیروں کے ہاتھوں میں ہم غریبوں کی گردن ہی تو آتی ہے. وہ مسکرایا تھا۔

تم میرے دوست کو.....دھمکی دے رہی ہو۔۔۔

احمر ڈرتے ڈرتے بولا...چند لمحے پہلے زاویار کو علایا فوبیا سے متعارف کرانے والا خود اس بیماری میں مبتلا تھا۔

دھمکی نہیں دے رہی، وارننگ دے رہی ہوں.. اس نے انگلی سے زاویار کو تنبیہہ کی۔

علایاملک سے ٹکرانے سے پہلے ایک بار اپنی حیثیت پر ضرور نظر ڈال لینا کہ تم میرا سامنا کر بھی پاؤ گے یا نہیں.. اس نے سر سے پاؤں تک زاویار کو دیکھا۔

زاویار سکندر کے ماتھے پر پڑے بل مزید گہرے ہوئے، اس کی رگیں تن گئی تھیں. اپنی دونوں مٹھیوں کو اس نے سختی سے مینچا ہوا تھا۔

جس دولت کے غرور میں تم مجھے دھمکیاں دے رہی ہو نا.. اسے سنبھال کر اپنے پاس رکھو... پھر آہستہ سے اس کے قریب ہوا.. یہ تمہارے برے وقتوں میں کام آئے گی۔

ایک طنز بھری مسکراہٹ سے اس کے چہرے کو دیکھا اور فوراً ہی وہاں سے احمر کے ساتھ پلٹ گیا. وہ اگر گہرے سمندر کا طوفان تھی تو وہ بھی اس طوفان کے مخالف سفر کرنے والا ہلسا مچھلی بن گیا تھا. وہ بھلا کون تھا علایا کو نصیحت کرنے والا؟؟

خیر جو بھی تھا مگر یہ تو طے ہو گیا تھا کہ وہ علایاملک کی کسی دھمکی سے ڈرنے والا نہیں تھا۔

* * * * * * * * * *

کچھ مہینوں بعد

سردی نے کروٹ لی تو دن بدن پورا کراچی گرمی کی لپیٹ میں آرہا تھا. گرمی بڑھتی ہی جارہی تھی کبھی گرم باتوں کی طرح تو کبھی گرم رویوں کی طرح۔

زاویار کو ڈگری ملتے ہی جاب کی آفر بھی آگئی تھی جو اس نے منع کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا. شروع کے کچھ دن تو وہ انٹرنی کے طور پر کام کرتا رہا مگر اب پورے ۲۰ دنوں میں اس نے اپنی پوزیشن اپنے باس کی نظر میں کافی مضبوط کرلی تھی۔

یہ شیراز اقبال کا بڑا سا آفس تھا جس میں انھوں نے زاویار کو اپنے مینیجر کے طور پر منتخب کرلیا تھا. وہ زاویار کی ذہانت سے ہمیشہ سے ہی متاثر رہے تھے. وہ زاویار کو پچھلے چار سالوں سے جانتے تھے اور اس کی ڈگری ملنے کے منتظر تھے. اکثر اوقات تو وہ زاویار سے اپنے بزنس کے مسئلے بھی ڈسکس کرلیتے تھے. جن کا زاویار کے پاس بہترین سولیوشن ہوتا تھا۔

آج زاویار سکندر اس آفس کے بڑے سے کمرے میں بیٹھا اپنے کام میں مشغول تھا۔ کانچ کی چھوٹی سی بنی ہوئی خوبصورت ٹیبل پر کچھ کاغذات پڑے تھے اور وہ کرسی پر بیٹھا اپنا چہرہ لیپ ٹاپ کے سامنے کیے ہوئے تھا. جینز کے ساتھ شرٹ پہنے وہ آستینیں

کہنیوں تک موڑے ہوئے تھا.اس کی انگلیاں مسلسل لیپ ٹاپ پر کچھ ٹائپ کر رہی تھیں.جب ہی دروازے پر دستک ہوئی اور اگلے ہی لمحے وہ اجازت لئے بغیر ہی داخل ہو گیا.لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہ بلکل اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

زاویار سکندر!!آپ کے خلاف ایک کمپلین آئی ہے..اس کے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں تھے۔

کونسی کمپلین سر؟وہ نہایت معصومیت سے بولا۔

کمپلین یہ ہے کہ آپ اپنے کام میں اتنے مشغول ہو گئے ہیں کہ اپنے اکلوتے دوست احمر کو بھی بھول گئے ہیں.احمر کافی خفا ہوتے ہوئے بولا۔

اس کے ماتھے پر بل پڑے ہوئے تھے.احمر چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

تو نہیں سدھرے گا نا؟وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

اگر میں سدھر گیا تو تیرا کیا ہو گا؟وہ اتنی معصومیت سے بولا کہ زاویار اسے دیکھ کر رہ گیا۔زاویار نے اسے سرسری نگاہ ڈال کر دیکھا۔

جو ہو گا اچھا ہی ہو گا..اس نے اپنے لیپ ٹاپ پر نگاہیں مرکوز کر لیں اور کچھ ٹائپ کرنے لگا۔

تو ابھی کیا برا ہو رہا ہے؟ اچھی جاب مل گئی اور کیا چاہیئے؟ مجھے دیکھا ہے اب تک.. جاب لیس بیٹھا ہوں.. وہ افسردگی سے بولا۔

زاویار نے یونہی اسے دیکھا پھر جیسے کچھ سوچتے ہوئے بولا

"میرے بھائی احمر... کمانے کے لئے جوتیاں گھسنی پڑتی ہیں، محنت کرنا پڑتی ہے۔"

تیرے جیسے مینیجر کے ہوتے ہوئے اس آفس میں کبھی جاب نہیں ملنے والی. وہ افسردہ ہوا تھا۔

چچ چچ.. کتنا ڈرامے باز ہے تو... انکل تو چاہتے ہیں کہ تو اپنا آفس سنبھالے مگر تو پتہ نہیں کن خیالوں میں ہے؟ زاویار نے لیپ ٹاپ کا سوئچ آف کیا اور اپنے دونوں ہاتھوں کو میز پر رکھ دیا۔

میں بابا کے آفس میں کام نہیں کرنا چاہتا.. میں کچھ اور کرنا چاہتا ہوں.. وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

زاویار نے ابرو اٹھا کے اسے دیکھا۔

اور اس کے جواب میں زاویار اسے حیرانی سے دیکھے گیا۔

* * * * * * * * *

یہ کلفٹن کا ایریا تھا جہاں ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت بنگلے بنے ہوئے تھے. ان ہی میں سے ایک بنگلہ جو کافی بڑا اور خوبصورت طرز کا بنا تھا. یہ بنگلہ رات کی تاریکی میں بھی چکا چوند چمک رہا تھا. بنگلے میں بنایا گیا لان کافی بڑا تھا. لان کے دوسری طرف سوئمنگ ایریا بھی بنایا گیا تھا۔

اس بنگلے کے کچن سے مزے مزے کے کھانے کی خوشبوئیں آرہی تھیں جس سے بنگلے میں موجود تمام لوگوں کو بھوک کے دورے پڑ رہے تھے۔

بنگلے کے لاؤنج میں بڑی سی ڈائننگ ٹیبل تھی جس پر گھر کے تمام افراد براجمان تھے جو کھانے کا انتظار کر رہے تھے۔

وہ جو لمبی اور نازک سی لڑکی کچن میں کھڑی تھی، وہ کبھی ایک طرف دوڑتی تو کبھی دوسری طرف. اس نے تمام پکوان تیار کر لئے تھے اور اب بس سرو کرنے کی دیر رہ گئی تھی۔

اس نے لال رنگ کی کرتی پہن رکھی تھی، جس کے ساتھ کنڑاس میں وائٹ ڈوپٹہ کندھوں پر لے رکھا تھا. بالوں کو اس نے سائیڈ کی مانگ نکال کر آگے کندھے پر ڈال

رکھا تھا. گوری چٹی رنگت اور پر کشش آنکھیں. وہ کافی اسمارٹ دکھتی تھی۔

اس بڑے سے کچن میں موجود ایک چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل تھی جس پر اکثر گھر کے ملازمین بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے. اس وقت ڈائننگ کی کرسی پر ایک مرد براجمان تھا جو کافی دیر سے اس لڑکی کو کام کرتا دیکھ رہا تھا۔ وہ ہٹّے کٹّے سے آدمی ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں موجود تھے. کندھوں پر انھوں نے ایک گلابی رنگ کا کپڑا ڈال رکھا تھا جس پر چھوٹی چھوٹی سی بوٹیاں پڑی تھیں. کالی داڑھی اور گھنی مونچھوں میں وہ ایک پینتیس سال کے بھلے انسان معلوم ہوتے تھے.

گریٹ! یو آر جینئیس ردا... وہ اپنے آپ کو داد دیتے ہوئے بولی تو خانساماں نے انھیں اوپر سے نیچے تک نظریں اٹھا کر دیکھا.

یہ میں لے کر جا رہی ہوں خانساماں، باقی سامان آپ لے آئیں. ردا نے جلدی سے بریانی کی پلیٹ اپنے ہاتھوں میں اٹھاتے ہوئے کہا اور تیزی سے کچن سے باہر آ گئی۔

یہ لڑکی نا جانے کب بدلے گی؟ خانساماں اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولے۔

بنگلے کے لاؤنج کے وسط میں خوبصورت میز رکھی تھی اور اسی میز کے سیدھ اوپر ایک کانچ کا خوبصورت فانوس لگا تھا جو ہلکی ہلکی ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔

لاؤنج میں سب لوگ اسی میز پر بیٹھے اپنی اپنی باتوں میں مگن تھے اور کھانے کے منتظر

تھے۔

آج کی تاریخ میں تو ہمیں کھانا نہیں ملنے والا..احمر جو بھوک سے بلبلا رہا تھا برا سا منہ بنا کر بولا۔

اب ہم کچھ نہیں کر سکتے سوائے انتظار کے. شیراز اقبال اپنے ہاتھ میں پہنی گھڑی کو دیکھتے ہوئے بولے جو پورے دس بجا رہی تھی۔ شیراز صاحب ایک اچھے خاصے پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے آدمی تھے. اس وقت وہ جے ڈاٹ کا کرتا پہنے کافی اسمارٹ سے دکھ رہے تھے. بالوں کو انھوں نے جیل لگا کر پیچھے کی طرف کر رہا تھا. ان کی پرسنیلٹی کافی سلجھی ہوئی معلوم ہوتی تھی. وجیہہ چہرے پر سمجھداری کے نقوش بھی نظر آتے تھے. خانساماں کے ہوتے ہوئے اسے کچن میں کس نے گھسنے دیا؟ احمر کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے اور اس کا غصے سے برا حال تھا۔

ردا نے نو بجے سے سب کو ٹیبل پر بٹھا دیا تھا اور مسلسل ایک گھنٹے سے وہ یہ ہی کہہ رہی تھی کہ بس پانچ منٹ اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کسی کی کیا مجال جو کوئی ردا کو کچھ کہے..رکشندہ شیراز نے احمر کو گھورتے ہوئے کہا۔

امی اس کے پانچ منٹ کب پورے ہونگے ؟ احمر دبے دبے غصے سے بولا

زاویار سکندر جورف سی جینز اور شرٹ پہنے احمر کے برابر میں خاموشی سے بیٹھا تھا وہ شیراز اقبال سے اس وقت بھی بزنس کی باتوں میں مصروف تھا۔

شیراز اقبال نے آج زاویار کو اس کے جاب ملنے کی خوشی میں انوائٹ کیا تھا. وہ زاویار کو بہت زیادہ پسند کرتے تھے. شیراز صاحب کا ایک بیٹا احمر تھا. ردا ان کی بیوی رکشندہ کے بھائی کی بیٹی تھی. ردا اپنے والدین کے انتقال کے بعد اپنی پھپھو کے گھر آ گئی تھی. شیراز صاحب نے اس میں اور احمر میں کبھی فرق نہیں کیا تھا. شیراز صاحب کی کوئی بیٹی نہیں تھی تو ردا کو ہی انھوں نے اپنی بیٹی بنالیا تھا. اسی طرح وہ زاویار کی ذہانت سے کافی مانوس تھے. وہ بلکل اسے ایک والد کی طرح ہی ٹریٹ کرتے تھے۔

NEW ERA MAGAZINE .com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

زاویار اکثر یہاں آیا کرتا تھا. احمر کے اسٹڈی روم میں بیٹھ کر یہ دونوں ساتھ اسٹڈی بھی کرتے تھے. زاویار کے تو تمام کانسیپٹس ہی کلئیر ہوتے مگر احمر کو کبھی ٹیچرز کے کانسیپٹس سمجھ ہی نہیں آتے تھے. وہ پیپر کے دنوں میں زاویار سکندر سے ہی پڑھ لیا کرتا تھا۔

اکثر ایسا ہی ہوتا ہے نا کہ ٹیچر کی بتائی ہوئی مشکل باتیں دوست کی آسان زبان میں سمجھ آجاتی ہیں۔

Finally, the dinner is ready.

ردا کی آواز پر سب نے اسے دیکھا۔

ارے ابھی تمہارے پانچ منٹ میں سے چار منٹ باقی ہیں۔

احمر اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔

ٹھیک ہے تو یہ میں واپس لے جاتی ہوں. ردا نے شرارت بھرے انداز سے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔

ردا نا کرو یار.... ردا جو ہاتھ میں ڈش پکڑے واپس پلٹ رہی تھی تو احمر نے اسے ٹوکا۔

. ویسے اتنی بھی دیر نہیں ہوئی اب. وہ فورا پلیٹی اور ٹرے میز پر رکھی

ہاں پورے ایک گھنٹے دس منٹ لیٹ ہوا ہے۔

احمر نے فوراً اپنی پلیٹ اٹھائی اور گرم گرم بریانی اپنی پلیٹ میں نکالی۔

رکشندہ خاتون نے جلدی سے ٹرے زاویار کی طرف بڑھادی۔

زاویار نے ذرا سی بریانی نکالی اور کھانا شروع کیا۔ وہ بلکل خاموش بیٹھا تھا۔

تم نے اپنے ہاتھوں سے ہمارے لئے کھانا بنا کر بڑا احسان کیا ہے. احمر اسے چھیڑنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔

ردا نے احمر کے برابر والی کرسی کھسکائی اور بیٹھ کر اپنی پلیٹ میں چاول نکالنے لگی۔

ایک منٹ.....ردا کی آواز پر سب کے منہ میں جاتے ہوئے چمچے والے ہاتھ یک لمحہ ٹھہر گئے تھے. سب نے اسے بغور دیکھا۔

تعریف کون کرے گا. یکدم ہی ردا جیسے کچھ یاد آنے پر بولی تو سب نے یکدم ہی ہنس پڑے. ردا نے اپنی پلیٹ میز پر رکھی اور سب سے پہلے احمر کی طرف اپنا رخ کر لیا گویا اس نے فیڈ بیک مانگا تھا۔

اس کھانے کی میں جتنی کم تعریف کروں وہ زیادہ ہو گی. وہ کھاتے کھاتے رکا اور اس کی طرف گردن موڑ کر بولا۔

کھانے میں نمک زیادہ، مرچیں کم ہیں بوٹیاں بھی ٹھیک سے گلی نہیں ہیں اور زردے کا رنگ بھی کافی زیادہ ہو گیا ہے۔

وہ فر فر تیزی سے بولا۔

اچھا اور کچھ رہ گیا تو وہ بھی بتا دو..احمر نے اس کے کھانے میں اتنی خامیاں گنوائیں کہ وہ چڑ کر بولی۔

باقی چیزیں ابھی میں نے ٹیسٹ نہیں کیں لیکن امید ہے کہ اس کا ذائقہ بھی ایسا ہی ہو گا. احمر نے ٹرے سے مزید بریانی نکالتے ہوئے کہا۔

ردا نے جھٹ اس کے ہاتھ سے ٹرے چھینی اور برا سا منہ بنا کر زبان باہر نکالی گویا اسے

چڑایا ہو. یہ ان کے گھر کا روز کا معمول تھا۔

ان کی ان تمام بحث پر یکدم ہی سب کے چہروں پر مسکراہٹ بکھر گئ۔

زاویار سکندر جوان کی تمام باتیں خاموشی سے سن رہا تھا اسے اپنا گھر یاد آیا تھا۔

ماں باپ کا چہرہ اس کے سامنے لہرایا تو ان سے ملنے کی تڑپ بڑھ گئ تھی لیکن وہ ابھی کراچی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا. وہ جس مقصد کے لے کراچی آیا تھا وہ اب تک پورا نہیں ہوا تھا۔

* * * * * * * * * *

ملک صاحب اپنے کمرے میں بیڈ پر سرہانے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے جب ہی ان کے سامنے دو مہینے پہلے علایا سے ہونے والی گفتگو کا منظر لہرایا۔

وہ دونوں ڈائینگ ٹیبل پر بیٹھے گفتگو میں مشغول تھے۔

ڈیڈ آپ دوسری شادی کر لیں۔

کک... کک.. کیا... لفظ ان کی زبان سے ادا نہیں ہو پا رہے تھے۔

ڈیڈ!! میں آپ کو مزید تنہا نہیں دیکھ سکتی۔

میں تنہا کب ہوں؟ تم میرے ساتھ ہو... کیا نہیں ہو؟ وہ حیرانی سے بولے۔

ڈیڈ!! ماما کے انتقال کو برسوں گزر گئے۔اس نے رک کر کچھ لمحے سوچا۔

آپ نے دوسری شادی کیوں نہیں کی؟وہ دونوں سامنے میز پر رکھے کھانے سے بلکل بے نیاز ہو گئے تھے۔علایا نے اپنے دونوں ہاتھوں کو میز پر رکھ لیا تھا۔

محل کی اونچی اونچی دیواریں بھی خاموشی سے ان کی گفتگو میں شامل ہو گئیں جنھوں نے برسوں پہلے اپنے اندر کئی راز چھپائے تھے۔

"انسان سے اچھے تو دیواروں کے کان ہوتے ہیں جو رازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔"

میں نے دوسری شادی اس لئے نہیں کی کیونکہ تمہاری ماں کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا علایا۔

NEW ERA MAGAZINE .com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

ان کی آنکھوں میں ماضی کے دیپ روشن ہوئے۔

میں نہیں مانتی ڈیڈ! ہر چیز کی کوئی نہ کوئی ریپلیسمنٹ ہوتی ہے۔اس نے گردن دائیں سے بائیں جانب ہلائی۔

ہر چیز کی ریپلیسمنٹ ہوتی ہے سوائے انسانوں کے۔" !تم ٹھیک کہہ رہی ہو علایا" انھوں نے یک لمحے رک کر ایک گہری سانس لی۔۔

جن سے سچی محبت ہو ان کو ریپلیس نہیں کیا کرتے۔ وہ دھیمے سے مسکرائے تھے۔

محل کی جگمگاتی روشنیوں میں بھی وہ ملک صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ کے پیچھے انکی اداسی کو باخوبی پڑھ سکتی تھی۔

ڈیڈ! کیا آپ ماما سے بہت محبت کرتے تھے؟

اس نے یونہی یہ سوال پوچھا تھا۔

محبت نہیں کرتا... عشق کرتا ہوں اس سے... وہ گہری آہ بھرتے ہوئے بولے۔

بات تو وہ ہی ہے نا ڈیڈ.. وہ بے نیازی سے شانے اچکاتے ہوئے بولی۔

او نہوں..... بات وہ نہیں ہے علایا.. انھوں نے گردن نفی میں ہلائی۔

اب تم مجھ سے پوچھو کہ محبت اور عشق میں کیا فرق ہے تو میں تمہیں بتاؤں.. وہ دونوں ہاتھوں کو میز پر رکھتے ہوئے ذرا آگے کو جھکے. انھوں نے علایا کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈالیں۔

محبت میں صرف دل جلتا ہے جبکہ عشق میں دل کے ساتھ ساتھ آپ کی روح کو بھی جلنا پڑتا ہے. عشق صرف ایک شخص کے گرد گھومتا ہے جبکہ محبت میں اور لوگوں کی محبت کی گنجائش ہوتی ہے. محبت میں صرف اس شخص سے محبت ہوتی ہے مگر عشق میں اس سے جڑی ہر چیز آپ کو عزیز ہوتی ہے۔

انھوں نے جیسے اپنی دلیل پیش کی تھی۔

ع

لایا جو دم سادھے انھیں سن رہی تھی. ڈیڈ کی دلی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے وہ بات کو بدلتے ہوئے بولی۔

ڈیڈ.....یہ کونسی فلم کا ڈائیلوگ ہے؟

وہ یکدم ہی زور سے ہنسی تھی..پورا محل اس کی ہنسی سے جھوم اٹھا تھا۔

یہ کسی فلم کا ڈائیلوگ نہیں...وہ منہ بنا کے بولے پھر یکدم ہی اپنے ہاتھوں کو سینے پر بل دیا اور کرسی سے ٹیک لگالی۔

علایا چند لمحے انھیں یونہی دیکھتی رہی۔

جب تمہیں کسی سے محبت ہو گی، پھر میں تم سے پوچھونگا. وہ خفا خفا سے بولے۔

ڈیڈ نہ تو میرے دل میں محبت لفظ کا کوئی کیڑا ہے اور نہ یہ لفظ میری ڈکشنری میں موجود ہے.....اس نے گہری نظروں سے چند لمحے انھیں دیکھا پھر جیسے کچھ سوچ کر بولی۔

مجھے لگتا ہے کہ کسی کی محبت میں گرفتار ہونے والے محض ایک غلام بن کر رہ جاتے ہیں اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ...غلامی مجھے پسند نہیں۔

وہ سپاٹ سے لہجے میں بولی تو ملک صاحب حیران نظروں سے اسے دیکھے گئے۔

وہ ماضی میں گم تھے کہ اچانک ہی دروازے پر دستک سے وہ حال میں واپس آئے۔

اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا تو وہ اندر داخل ہو گئ۔اس نے کالے رنگ کی ڈھیلی شورٹ شرٹ پر کالے رنگ کا ڈھیلا ڈھالا پجامہ پہنا تھا۔ بالوں کو اس نے ڈھیلے جوڑے میں لپیٹ رکھا تھا اور دو لمبی لٹیں جس کو اس نے کرل کر رکھا تھا،اس کے چہرے پر جھول رہی تھیں۔ گوری رنگت پر اس کے تیکھے نقوش اور اس پر اس کی مغرور ناک نے اس کے چہرے کی کشش کو اور بڑھا دیا تھا۔اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں چاندی کی سی چمک تھی۔

وہ چلتی ہوئ آئ اور ملک صاحب کے برابر میں بیٹھ گئ۔اس نے مسکرا کر انھیں دیکھا تو وہ بھی مسکرا دیئے۔

ڈیڈ!اس نے ان کے دائیں ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔

کیا آپ میری ایک خواہش پوری کریں گے؟وہ منت آمیز لہجے میں بولی تو ملک صاحب نے فوراً سیدھے ہوتے ہوئے اپنے پیروں کو بیڈ سے نیچے اتارا۔

کیا چاہیئے علایا؟وہ اس کی چاندی سی چمک والی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔

زایار سکندر.....وہ کچھ لمحے سوچنے کے لئے رکی تھی اور ملک صاحب پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔اب یہ لڑکی کیا چاہتی تھی؟

* * * * * * * * *

موسم چونکہ سرد تھا. رات کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں سے چھپ کر وہ اپنے اپارٹمنٹ کے کمرے میں بیڈ پر لیٹا تھا. اس کا اپارٹمنٹ کافی خوبصورت مگر چھوٹا تھا. اسے کبھی بھی بڑے گھر کی خواہش نہیں رہی تھی. وہ ہمیشہ سے ہی چھوٹے اور خوبصورت گھر پسند کرتا تھا۔

آج صبح سے ہی سردی کافی زیادہ تھی اور رات میں تو اس سردی نے شدت اختیار کر لی تھی. وہ سینے تک گرم لحاف اوڑھے لیٹا تھا. اس کی نظریں اپنے موبائل پر ٹکی تھیں، جو اس نے اپنے ہاتھوں میں چہرے کے سامنے لے رکھا تھا. کافی دیر سے آفس سے تھکا ہارا آنے کے بعد وہ اپنا فیس بک کا اکاؤنٹ کھولے اسکرولنگ کر رہا تھا، پھر تھوڑی ہی دیر میں وہ جیسے بیزار ہو گیا تھا. کچھ لمحوں میں اس نے اپنا انسٹا اکاؤنٹ کھولا. دوستوں کی تصاویر پر کچھ کمنٹس کے اور پھر بے زاری سے اسکرولنگ کرنے لگا۔

"سنگل لوگوں کی زندگی میں اسکرولنگ کرنا ہی تو لکھا ہوتا ہے۔"

تھوڑی ہی دیر میں اس نے اچانک اپنے اسکرول کرتے ہوئے انگوٹھے کو روکا. اس نے اس تصویر کو بغور دیکھا۔

اس نے نیرو پینٹ کے ساتھ شرٹ پہنی تھی اور اس پر لانگ کوٹ لے رکھا تھا. گھنے بالوں کو اس نے اونچی پونی میں باندھ رکھا تھا. وہ منڈیر سے لگے ایک خوبصورت جھولے میں بیٹھی سامنے کی طرف ہی دیکھ رہی تھی. یقیناً اس نے یہ تصویر کسی سے بنوائی تھی۔

زاویار کے سامنے علایا سے کچھ مہینوں پہلے ہونے والی گفتگو کا منظر لہرایا. اسے اس کا کہا ایک ایک لفظ یاد تھا. اسے باتیں اور شکلیں نہیں بھولتی تھیں۔

اس نے اس تصویر کو چند لمحے بغور دیکھا۔

وہ بلاشبہ بہت پیاری دکھ رہی تھی۔

بلکل ویلز کی شہزادی جیسی، بلکہ یوں کہو کہ مغرور شہزادی جیسی. وہ تصویر کے نیچے لکھا کیپشن پڑھنے لگا۔

Win, before losing fate.

"قسمت کے ہرانے سے پہلے جیت جاؤ۔"

افف... یہ لڑکی ہر وقت جیتنے کے بارے میں ہی سوچتی رہتی ہے. وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا. پھر نا چاہتے ہوئے بھی اس کے اکاؤنٹ میں چلا گیا. اکاؤنٹ چونکہ پبلک تھا تو فوراً ہی اس کی تمام تصاویر سامنے آ گئیں۔

وہ ایک ایک کر کے اس کی تصاویر دیکھتے جاتا اور کیپشن پڑھتا جاتا، یہاں تک کہ پورا آدھا گھنٹہ گزر گیا اور پھر کسی احساس کے تحت اس نے جھنجھلا کر موبائل بند کر کے بیڈ پر رکھ دیا۔

اوہ اللہ... میں نے اس مغرور لڑکی کو دیکھنے میں اپنا قیمتی وقت ضائع کر دیا. وہ کان پر ہاتھ رکھتے ہوئے جیسے شرمندہ ہوا تھا۔

یا اللہ.. کاش یہ وقت سے گزرنے سے پہلے سمجھ جائے.. اس نے اتنی دھیمی آواز میں کہا تھا کہ شاید ہی اس کے کانوں نے بھی سنا ہو مگر دعا تھی یا تیر؟ آسمان کی بلندیوں کو چیرتی ہوئی اللہ تعالی کے پاس پہنچ گئی تھی اور اب اس دعا کے پورے ہونے کا وقت آ گیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ملک صاحب کی زندگی اتنی بھی آسان نہیں تھی جتنی نظر آتی تھی. ایک سیاستدان ہونے کی حیثیت سے ان کی کوئی پرائیوسی نہیں رہی تھی. ان کے ہر عمل پر لوگوں کی نظریں لگی رہتیں اور ان کے بارے میں اکثر خبریں میڈیا پر گردش کرتی رہتیں. جن سے وہ سخت عاجز آ گئے تھے. انھیں خبروں کی وجہ سے وہ آہستہ آہستہ ذہنی دباؤ کا شکار

ہونے لگے. ان کی زندگی خوف کے گرد گھومنے لگی. نا جانے کس بات کا خوف تھا؟ وہ کسی سے کچھ شئیر بھی تو نہیں کرتے تھے. اتنے امیر کبیر ہونے کے باوجود بھی نا جانے کس بات کی بے چینی تھی؟

ملک صاحب اپنے کمرے کے بیڈ پر لیٹے تھے۔

آج محل کی اونچی اور مضبوط دیواروں نے انھیں بہت کمزور دیکھا تھا. ان کی طبیعت آج کافی غیر ہو گئی تھی کہ زرینہ بی کے دوائی دینے کے بعد بھی وہ سنبھل نہیں پائے تھے. زرینہ بی نے وقت پر ملک صاحب کے ڈاکٹر کو کال کر دی تھی۔

ملک صاحب کے ڈاکٹر ستار نیازی قد کے حساب سے ذرا لمبے اور دبلے پتلے سے ایک خوبرو آدمی تھے. جن کی عمر چالیس سے پینتالیس کے درمیان تھی. ستار نیازی نے پینٹ شرٹ پر ڈاکٹر والا وائٹ کوٹ پہنا تھا. ناک پر انھوں نے پتلے عینک چڑھا رکھے تھے اور وہ کچھ ہی دیر میں ملک صاحب کے کمرے میں کھڑے ان کا معائنہ کر رہے تھے۔

ملک صاحب نیم بے ہوشی میں بھی محو گفتگو تھے. وہ کچھ کہہ رہے تھے مگر ان کی آواز اتنی آہستہ تھی کہ ڈاکٹر نے اپنا کان ان کے لبوں کے پاس لگایا۔

م...م..میں...ق۔۔۔۔

ع...ع....ع...علا.....علایا۔۔۔۔۔

ملک صاحب ٹھیک تو ہو جائیں گے نا؟زرینہ بی مارے گھبراہٹ کے جلدی سے ڈاکٹر کے پاس آ گئیں۔

یہ کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن میں سمجھ نہیں پا رہا۔

علایا جو ابھی ابھی آؤٹنگ سے آئی تھی

یکدم ہی وہ تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی۔

اس کی دھڑکنیں بے ترتیب تھیں اس نے چند گہری گہری سانسیں لے کر اپنا سانس بحال کرنے کی کوشش کی. وہ یقیناً دوڑتے ہوئے اوپر آئی تھی. سنہری رنگت والے چہرے پر اداسی چھائی تھی. اس نے ملک صاحب کو اس طرح لیٹے دیکھا تو شدت جذبات سے اس کی آنکھوں کے کٹورے بھیگنے لگے۔

وہ ان کے قریب آئی تو ان کے دائیں ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

ڈیڈی!!وہ دھیمی آواز میں بولی۔

میں...م...میں نے.....وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔

میں نے...کسی...کو...وہ نیم بے ہوشی میں اٹک اٹک کر بولے۔

ڈیڈ کو کیا ہوا ہے؟ وہ فوراً ہی اپنے آنسوؤں کو صاف کرتی ہوئی ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہوئی۔

ڈپریشن... ڈاکٹر نے یک لفظ جواب دیا۔

ڈپریشن؟؟؟ اس نے حیرانی سے زیر لب دھرایا۔

ڈاکٹر نے اثبات میں گردن ہلائی تو اس نے اپنے ڈیڈ پر ایک نظر دوڑائی۔

سوری ٹو سے... مگر مجھے لگتا ہے کہ آپ ڈیڈ کی بیماری کو جج نہیں کر پائے... ڈیڈ کو بھلا کس چیز کا ڈپریشن ہو گا؟ ہم امیروں کی ڈکشنری میں یہ لفظ نہیں ہوتا... وہ پر اعتماد انداز میں بولی۔

NEW ERA MAGAZINE .com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

ڈاکٹر ستار نیازی نے عینک کے پیچھے اپنی آنکھوں سے زرینہ بی کو دیکھا۔

زرینہ بی کیا آپ مجھے اور علایا کو کچھ دیر کے لئے اکیلا چھوڑ سکتی ہیں؟

انھوں نے اس طرح کہا کے زرینہ بی برا سا منہ بناتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔

ڈاکٹر ستار نے ملک صاحب کے کمرے میں موجود صوفے پر علایا کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اس نے بھوری آنکھوں سے انھیں دیکھا پھر خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

ستار نیازی بھی اس کے برابر والے صوفے پر براجمان ہو گئے تو علایا نے اپنا رخ ان کی طرف کر لیا۔

علایا ابھی آپ کافی چیزوں سے بے خبر ہیں، جب آپ پریکٹیکل لائف میں آئیں گی تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ سب سے زیادہ ڈپریشن میں مبتلا ہونے والے امیر ہی ہوتے ہیں.

وہ اسے سمجھانے والے انداز میں بولے۔

مگر ڈیڈ کو کس چیز کی کمی ہے آخر؟ وہ شانے اچکاتے ہوئے بولی۔

ضروری تو نہیں کہ صرف بیرونی شے کی کمی ہی ڈپریشن کا باعث ہو، کبھی کبھی اندرونی شے کی کمی بھی انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی جس کی وجہ سے انسان ڈپریشن میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

علایا کیا آپ کو پتہ ہے کہ اندرونی شے کی کمی کیا ہوتی ہے؟ انھوں سامنے بیٹھی خاموش علایا سے پوچھا۔

وہ جو اپنے نازک ہاتھوں کو گود میں رکھے بیٹھی تھی، اس نے آہستہ سے اپنی گردن نفی میں ہلائی۔

سکون... وہ دھیرے سے بولے۔

کمرے میں یک لمحے بلکل خاموشی چھا گئی۔

سکون... علایا نے زیرِ لب دھرایا۔

جی سکون... امیروں کو دولت کی کمی نہیں بلکہ سکون کی کمی مار دیتی ہے. وہ صاف

گویائی سے بولے تو علایا بے یقینی کے عالم میں سامنے بیڈ پر لیٹے اپنے ڈیڈ کو دور سے دیکھے گئی۔۔

* * * * * * * * * *

ملک صاحب کو ستار نیازی نے ان کی بیماری کے باعث ہسپتال میں داخل کر لیا تھا۔

یہ ایک وسیع و عریض کمرہ تھا بلکل ان کے محل کے کمرے جیسا، جس میں ہر آسائش موجود تھی. بیڈ کے سامنے والی دیوار پر بڑی سی ایل اے ڈی بھی لگی تھی. چھوٹا سا صوفہ سیٹ بھی اس کمرے میں موجود تھا. وہ ہر شے سے بے خبر مریضوں والے لباس میں آنکھیں موندے بیڈ پر لیٹے تھے۔

علایا بھی کمرے میں موجود صوفے پر بیٹھی تھی. اس نے اپنا سارا دھیان موبائل میں لگا رکھا تھا اور گاہے بگاہے وہ ملک صاحب پر ایک نظر مار لیتی۔

کالے رنگ کی خوبصورت کرتی میں اس نے سر پر ڈھیلا ڈھالا جوڑا بنا رکھا تھا. پاؤں میں کالے رنگ کے کھوسے پہنے تھے جن کے وسط میں ایک خوبصورت موتی چمک رہا تھا۔

پانی.....وہ دھیمی آواز میں بولے تو علایا کو ان کی آواز آ گئی. وہ تیزی سے اٹھی اور

کمرے میں موجود ڈسپینسر سے گرم پانی کا ایک گلاس بھر کر ملک صاحب کے پاس آئی تو وہ بیڈ سے ٹیک لگائے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔اس نے اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے انھیں پانی پلایا۔

بے بسی،اضطراب،الجھن،پریشانی..ناجانے وہ اس وقت کتنی کیفیات میں گھری ہوئی تھی۔اس کے ڈیڈ کی بیماری اس کے لے کوئی عام نہیں تھی۔

ڈیڈ...آپ ٹھیک ہیں؟وہ کانچ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی۔

میں بلکل ٹھیک ہوں..وہ مسکرائے تھے۔

ان کا آج ہسپتال میں دوسرا دن تھا اور کافی سیاسی پارٹیز اور بزنس کے لوگ ان کی عیادت کو آچکے تھے۔

ڈیڈ آپ سے ایک بات پوچھوں؟وہ وہیں بیڈ پر بیٹھ گئی۔

انھوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

ڈیڈ....آپ کس بات سے پریشان ہیں؟اس کی سمندر سے گہری آنکھیں جاننے کے لئے بے تاب تھیں۔

مجھے کوئی پریشانی نہیں...وہ سفید چہرے سے بولے۔

علایا...میں بوڑھا ہو گیا ہوں...میں چاہتا ہوں کہ اب تم میرا بزنس سنبھالو...وہ سوچ

کر بولے۔

سر اور داڑھی کے سفید بالوں سے وہ اور بوڑھے نظر آنے لگے. شکل پر پڑی شکنوں سے لگتا تھا کہ زندگی نے انھیں تھکا دیا ہو۔

ڈیڈ.. وہ تو ٹھیک ہے لیکن مجھے کوئی تجربہ نہیں. وہ صاف گویائی سے بولی۔

شروع میں کسی کے پاس بھی تجربہ نہیں ہوتا، یہ تو سیکھنے سے ملتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم جلد ہی سیکھ جاؤ گی. علایا شروع میں کوئی پرفیکٹ نہیں ہوتا. آگے بڑھنے کے لئے کوشش کرنا پڑتی ہے، کبھی کبھی بڑی بڑی ناکامیوں سے گزرنا پڑتا ہے اور کبھی لمحوں میں کامیابی آپ کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے. ناکامی سے گزر کر ہی کامیابی کا حصول ہوتا ہے

ملک صاحب اسے سمجھانے والے انداز میں بولے۔

ٹھیک ہے ڈیڈ... وہ بے نیازی سے شانے اچکاتے ہوئے بولی۔

علایا... ایک بات اور.... انھوں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ دھیمے سے مسکرا دی۔

وہ گہری سانس لے کر بولے۔ **"انتقام میں جلنا چھوڑ دو۔"**

* * * * * * * * *

شام کا سہانا موسم تھا. جگہ جگہ سرمئی بادلوں سے آسمان ڈھکا تھا مگر کہیں کہیں سے نیلا آسمان بھی نظر آتا تھا. شیراز صاحب اپنے لان میں کرسی پر براجمان تھے. رکشندہ بیگم بھی ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھی ان سے محو گفتگو تھیں۔

اب وقت آگیا ہے کہ احمر آپ کا آفس سنبھالے اور آپ گھر پر آرام کریں۔

میں بھی یہ ہی چاہتا ہوں مگر احمر نا جانے کن چکروں میں پڑا ہے۔

رکشندہ بیگم نے چائے کا کپ ان کی طرف بڑھایا. گرم گرم چائے سے اٹھتا دھواں ہوا میں محو ہو گیا۔

آپ کہیں تو میں احمر سے بات کروں؟ کچھ عرصے میں اس کی شادی بھی کرنی ہے. وہ اپنے اڑتے ہوئے بالوں کی لٹوں کو کان کے پیچھے اڑستے ہوئے بولیں۔

رکشندہ شیراز بے حد محبت کرنے والی ایک خوبصورت اور ماڈرن سی خاتون تھیں. ان کے اسٹائل میں کٹے ہوئے بالوں نے انھیں کافی اسمارٹ بنا دیا تھا۔

رکشندہ بیگم... اگر آپ اپنے بچوں کو ایک اچھا انسان بنانا چاہتی ہیں، تو ان کی ہر بات نہیں مان لینی، ان کی ہر خواہش کی تکمیل نہیں کرنی. انھیں ہر چیز پلیٹ میں سجی سجائی

نہیں دینی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انھیں اپنے سہارے کا عادی نہیں کرنا۔

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لئے رکے۔

جب تک احمر اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو گا، میں اس کی شادی نہیں کروں گا. وہ اٹل لہجے میں بولے. پھر چائے کا کپ منہ سے لگاتے ہوئے ایک گھونٹ بھرا۔

چند لمحوں کے لئے لان میں خاموشی چھا گئی۔

احمر کے برعکس زاویار کو دیکھا تم نے؟ کتنا سمجھدار اور ذہین لڑکا ہے... کاش زاویار میرا سگا بیٹا ہوتا تو مجھے کوئی پریشانی نہ ہوتی. اس نے میرا آفس بہت اچھے سے سنبھالا ہے. وہ زاویار کا ذکر کرتے ہوئے یکدم ہی خوش ہو گئے تھے۔

کس نے آپ کا آفس اچھے سے سنبھالا ہے؟ اس سے پہلے کے رکشندہ کچھ کہتیں احمر کی آواز انھیں اپنے پیچھے سنائی دی. وہ شیراز صاحب کے بلکل سامنے سے چلا آرہا تھا اور اس کے ساتھ زاویار بھی تھا. اسٹائل سے بال اس کے ماتھے پر گرے تھے. گرے پینٹ میں ہاتھ ڈالے وہ مسکراتا ہوا ان کی طرف ہی بڑھ رہا تھا۔

شیراز صاحب نے فوراً اپنے ہاتھوں میں تھاما ہوا چائے کا کپ میز پر رکھا. ان کے چہرہ یکدم ہی ہشاش بشاش ہو گیا تھا. وہ اسے دیکھ کر دھیمے سے مسکرا دیئے۔

اسلام وعلیکم!! اس نے زور سے سلام کیا پھر شیراز صاحب سے مصافحے کے لئے ہاتھ

بڑھایا تو انھوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

رکشندہ نے بھی مسکرا کر اسے دیکھا پھر رسمی سی بات چیت کے بعد وہ فوراً ہی لان سے جانے کیلئے کھڑی ہو گئیں۔

تم دونوں کیلئے ابھی چائے بھجواتی ہوں.. وہ مسکراتی ہوئی وہاں سے پلٹ گئیں۔

احمر اور زاویار کرسی کھسکا کر بیٹھے تو یہاں وہاں کی گفتگو کرنے لگے۔

شیراز صاحب وقتاً فوقتاً ان کی گفتگو میں حصہ لیتے رہے۔

شام گہری ہونے لگی تو سورج نے نارنجی رنگ اختیار کیا. سورج ڈھلنے کے قریب ہونے لگا تو منظر بے حد خوبصورت معلوم ہونے لگا۔

مجھے ذرا ضروری کام سے باہر جانا ہے. کیا تم دونوں میرے ساتھ چلو گے؟ شیراز صاحب کرسی سے اٹھتے ہوئے بولے۔

کہاں جانا ہے ڈیڈ؟ احمر نے شانے اچکائے۔

ملک صاحب کی عیادت کو جانا ہے، سنا ہے بہت بیمار ہیں۔

ملک صاحب بیمار ہیں؟ زاویار حیرانی سے بولا۔

شیراز صاحب نے اپنی گردن کو اثبات میں ہلایا۔

وہ دونوں فوراً ہی ہسپتال جانے کیلئے تیار ہو گئے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ تینوں ہسپتال پہنچنے کے بلکل قریب تھے. احمر نے گاڑی پارکنگ لاٹ میں کھڑی کی توشیراز صاحب جو گاڑی میں آگے بیٹھے تھے فوراً ہی گاڑی سے باہر نکلے۔

زاویار نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو احمر نے اپنا چہرہ پیچھے کی جانب موڑ کر اسے روکا۔

میں تو کہتا ہوں کہ اندر جانے سے پہلے تو ایک بار سوچ لے. احمر نے اسے مفت مشورہ دیا تھا۔

بڑا آیا فہد مصطفی... وہ ہنستے ہوئے بولا۔۔۔

ایسا نا ہو کہ علایا اپنے باپ کی بیماری کا الزام بھی تیرے سر ڈال دے. وہ شرارت بھرے انداز میں بولا تو زاویار یکدم ہی ہنس پڑا۔۔

پتہ نہیں کیوں جلتی ہے مجھ سے. وہ شانے اچکاتے ہوئے مسکرایا۔

وہ تجھ سے نہیں، بلکہ تیری کامیابی سے جلتی ہو. اس نے اپنی طرف کا ہینڈل کھولا اور باہر نکلا. زاویار بھی اس کے پیچھے باہر آیا تھا۔

یہ تو کچھ نہیں احمر، ابھی میں نے بہت آگے جانا ہے... اتنا آگے کہ.... وہ یکدم ہی خاموش ہو گیا۔

احمر مسکرا کر اسے دیکھتا رہ گیا۔

* * * * * * * * * *

احمر اور زاویار ہسپتال کے باہر پارکنگ لاٹ میں کھڑی گاڑی سے باہر آ گئے تھے. احمر کی تمام باتیں زاویار کو درست ہی معلوم ہوئی تھیں. وہ واقعی اس کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا کہ کہیں علایا باپ کی بیماری بھی اس کے سر نہ ڈال دے۔

احمر نے تو سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اندر نہ جانا ہی مناسب سمجھا تھا. زاویار نے بھی اپنا ارادہ بدلا، مگر شیراز صاحب زاویار کو ملک صاحب سے ملوانا چاہتے تھے تو وہ اسے اپنے ساتھ اندر لے گئے. ان کے اندر جاتے ہی احمر گاڑی سے ٹیک لگائے، ہاتھوں کو سینے پر بل دیے کھڑا ہو گیا. گرمی میں شام کی ٹھنڈی ہوا وقفے وقفے سے اسے چھوتی ہوئی گزرتی تھی. وہ یونہی سامنے کی طرف دیکھ کر دھیمی آواز میں گنگنانے لگا تھا. اس کی نظریں گھومتی ہوئی ہسپتال کے دروازے تک آ گئیں کہ اچانک اس کی نظریں اس پر ٹھہر گئیں تھیں. وہ ہسپتال کے دروازے سے باہر آ رہی تھی. اس نے نیلے رنگ کی فراخ زیب تن کر رکھی تھی جو اس کے ٹخنوں تک آتی تھی، اس کا رنگ کافی گورا تھا. احمر کو لگا کہ وہ دودھ کی نہر سے نکل کر آئی ہے. اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور ناک بلکل

کھڑی. سر پر اس کے نیلا اسکارف، جو اس نے ذرا اسٹائیل میں باندھا ہوا تھا. وہ لڑکی اسے نیلی گڑیا لگی تھی. خوبصورتی کا پیکر. اس کے گنگناتے ہوئے لب یکدم ہی رکے تھے. بقول اس کے اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار اتنی خوبصورت لڑکی دیکھی تھی۔

ماشاءاللہ.... اسے دیکھ کر اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا۔

وہ قدم قدم بڑھتی ہوئی اس کے قریب آرہی تھی. اسے اپنا دل موم کی طرح پگھلتا ہوا محسوس ہوا تھا. کسی اجنبی احساس نے اسے اپنی طرف مائل کر لیا تھا. اس سے پہلے اس نے کسی کے لے کبھی کوئی جذبہ محسوس نہیں کیا تھا. وہ تو شریف سا سیدھا سادھا سا لڑکا تھا. اس نے ہمیشہ اپنے بارے میں یہ ہی سوچا تھا۔

وہ بغیر پلکھیں جھپکائے اسے دیکھ رہا تھا. احمر کی آنکھوں کی محویت کو اپنے اوپر محسوس کرنے والی لڑکی نے فوراً پلکھیں اٹھا کر احمر کو دیکھا. احمر پلک جھپکنا ہی بھول گیا تھا. اس نے اپنی نظریں نہیں ہٹائی تھیں. وہ ہٹا ہی نہیں سکتا تھا. عجیب سحر میں مبتلا ہو گیا تھا. یہ دل کا معاملہ تھا تو دماغ بھی سن ہو گیا تھا. ہر شے سے بیگانہ سوچ سمجھ سے خالی۔

وہ جو تیزی سے چلتی آرہی تھی احمر کی نظروں کو دیکھ کر اس کے قدم ڈھیلے پڑے تھے. اس نے احمر کو بغور دیکھا. اسے وہ کوئی پاگل لگا تھا. وہ تیزی سے احمر کے برابر سے گزرتی ہوئی اپنی گاڑی کی طرف آئی۔

احمر جو اتنا بیگانہ ہو گیا تھا کہ اس نے اپنی آنکھوں کے ساتھ ساتھ پوری گردن ہی موڑ لی تھی۔

اس لڑکی نے جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور لمحہ ضائع کئے بغیر فوراً ہی اس میں بیٹھ گئی۔اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے اور اسے اس پر شدید غصہ آ رہا تھا۔

پتہ نہیں یہ پاکستان کے لڑکے کب بدلیں گے۔اس نے بڑبڑاتے ہوئے چابی اگنیشن میں ڈالی اور تیزی سے گاڑی کو بھگاتے ہوئے وہاں سے لے گئی۔

احمر نے محسوس کیا تھا کہ وہ صرف گاڑی لے کر نہیں گئی بلکہ احمر شیراز کا معصوم سا دل بھی لے گئی ہے۔

NEW ERA MAGAZINE .com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

جب اس کی گاڑی نظروں سے دور ہوئی تو جیسے اسے خیال آیا۔

اوہ گاڈ احمر...پہلا امپریشن کتنا غلط پڑا ہو گا اس پر...اس نے ملامت کرتے ہوئے دل میں سوچا۔

وہ کون تھی؟وہ اسے اب کہاں ملنی تھی؟یہ اسے بھی معلوم نہ تھا۔

* * * * * * * * *

شیراز صاحب زاویار کے ساتھ ہسپتال کے اندر داخل ہوئے تو اس کا دماغ سوالوں میں

اسے الجھانے لگا۔

اگر علایا کمرے میں ہوئی تو مجھے دیکھ کر نا جانے کیا ردِّ عمل ظاہر کرے گی؟

اگر اس نے انکل کے سامنے میری انسلٹ کر دی تو؟

یہ تو یہاں آنے سے پہلے سوچنا چاہیئے تھا. اس کے دل کے کسی کونے سے آواز آئی تھی۔

شیراز صاحب نے کاؤنٹر سے تمام معلومات لے لی تھی اور اب وہ دونوں سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔

مطلوبہ کمرے پر پہنچ کر شیراز صاحب نے دروازہ کھٹکھٹایا پھر آہستہ سے کھول کر اندر آ گئے. اے سی چلنے کے باعث کمرہ برف جیسا ٹھنڈا معلوم ہوا تھا۔

ملک صاحب بیڈ پر بیٹھے تھے. انھوں نے ہسپتال والا ڈھیلا ڈھالا سا سفید گاؤن پہنا تھا.

ان کا چہرہ بیماری سے سفید پڑا تھا. اس وقت کمرے میں ملک صاحب کے علاوہ اور کوئی نہ تھا. "شکر" زاویار کے دل سے بے ساختہ نکلا۔

"انسان وہ واحد ہستی ہے جو کسی شخص سے نہیں ڈرتا بلکہ اس کی زبان سے ڈرتا ہے، اس کے ہاتھوں ہونے والی اپنی بے عزتی سے ڈرتا ہے، اس کی زبان سے نکلے ہوئے غلط لفظوں سے ڈرتا ہے اور اس کے غلط ارادوں سے ڈرتا ہے۔"

شیر از صاحب کو دیکھتے ہی ملک صاحب دھیمے سے مسکرا دیئے۔ ملک صاحب اور شیر از صاحب بزنس میں ایک دوسرے کے پارٹنرز تھے۔ شیر از صاحب نے اپنا دایاں ہاتھ مصافحے کے لے بڑھایا تو ملک صاحب نے گرم جوشی سے ان کا ہاتھ تھاما۔ ان کی نظر مسلسل زاویار پر ٹکی ہوئی تھیں۔ زاویار سے ملنے کے بعد وہ جیسے اس شخص کو جاننا چاہتے تھے۔

شیر از صاحب بیڈ کے برابر میں رکھی کرسی کھسکا کر وہاں بیٹھ گئے تھے اور زاویار وہ وہاں سے تھوڑا فاصلے پر رکھے ہوئے صوفے پر پر اجمان ہو گیا۔

ملک صاحب یہ کیا حال بنا لیا آپ نے؟ شیر از صاحب بڑی فکر مندی سے بولے۔

میں بلکل ٹھیک ہوں۔ ان کا چہرہ بیماری سے سفید ہو رہا تھا۔

ملک صاحب آپ جانتے ہیں کہ ملک آف انڈسٹری آپ کے بغیر ادھوری ہے۔ ان چند مہینوں میں انڈسٹری بہت ڈاؤن ہوئی ہے۔ پھر ایسے میں ہماری کمپنی بھی آپ کی انڈسٹری سے جڑی ہے۔ وہ یونہی سرسری سا بولے۔

تو یوں کہیے کہ آپ کو اپنی کمپنی کی فکر ہے، بجائے ہماری صحت کے۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے طنز کیا تھا۔

ویسے تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے.. میں نے تمہاری کمپنی کی رینکنگ دیکھی

ہے، کافی اچھی رہی ہے کچھ مہینوں سے. ملک صاحب کی اس بات سے شیراز صاحب دھیمے سے مسکرادیئے۔

زاویار جس نے اپنا سارا دھیان اپنے موبائل میں مرکوز کر رکھا تھا. وہ شاید ان کی گفتگو کا حصہ نہیں بننا چاہتا تھا۔

یہ لڑکا کون ہے؟ ملک صاحب نے زاویار کو دیکھتے ہوئے کافی دھیمی آواز میں شیراز صاحب سے پوچھا۔

یہ زاویار سکندر ہے.. میرا مینیجر ہے بلکہ یوں سوچ لیں کہ میرا دوسرا بیٹا ہے. انھوں نے بھی آہستہ سے جواب دیا تھا۔

زاویار سکندر اس وقت ٹانگ پہ ٹانگ جمائے، نظریں موبائل پر مرکوز کئے ہوئے تھا. رف سی جینز اور پینٹ میں بھی چہرے پر وجاہت تھی۔

زاویار کا نام سن کر ملک صاحب نے اس کا پورا جائزہ لیا تھا. یہ نام انھوں نے علایا کے منہ سے کئی بار سن رکھا تھا. وہ حیران نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے. ان کے اس طرح دیکھنے پر زاویار نے نظر اٹھا کے انھیں دیکھا پھر دھیرے سے مسکرادیا۔

تو یہ ہے زاویار سکندر... کچھ دن پہلے علایا کے ساتھ ہونے والی گفتگو انھیں ابھی بھی یاد

تھی. انھوں نے سوچا پھر اسے دیکھ کر مسکرا دیئے۔

کیا یہ لڑکا قابل اعتبار ہے؟ انھوں نے نہایت دھیمی آواز میں کہا۔

مجھے اپنے سگے بیٹے سے زیادہ اس پر اعتبار ہے۔

زاویار سکندر جو اپنے کام میں مگن تھا اور ادھر ملک صاحب کسی اور ہی سوچوں میں مگن ہو گئے۔

یہ زاویار اور ملک صاحب کی پہلی ملاقات تھی جو بلکل خاموش ملاقات رہی تھی. نہ انھوں نے زاویار کو مخاطب کیا تھا اور نہ اس نے ملک صاحب سے کوئی بات کرنا چاہی تھی اور زاویار یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی ملک صاحب کے ساتھ کی جانے والی پہلی ملاقات آخری ملاقات بننے والی تھی۔

* * * * * * * *

وہ جو شاہی انداز میں اپنے ڈیڈ کے آفس میں بیٹھی تھی. لمبے قد پر براؤن رنگ کی شورٹ شرٹ پہنی تھی. جس پر سفید رنگ کے دھاگے سے خوبصورت کڑاہی کی گئی تھی. اس کے ساتھ براؤن رنگ کا پتلا پجامہ تھا جو ٹخنوں سے کافی اوپر تھا. یہ دورِ جدید کا فیشن تھا جو اس پر کرنالا گو تھا. ڈوپٹے سے تو دور دور تک اس کا کوئی تعلق نہیں تھا.

اس کے سیدھے سلکی بال جس کو اس نے اونچی پونی میں باندھ رکھا تھا. دو لمبی لٹیں کرل ہو کر اس کے رخسار پر بوسہ دیتی تھیں. اس وقت آفس کے کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔

ملک صاحب بھی دن بدن کافی بہتری کی طرف آ گئے تھے. اسے ڈیڈ کے آفس آتے ہوئے تقریباً دو ہفتے ہو گئے تھے اور ان دنوں میں اس نے کافی کچھ سیکھ لیا تھا. آفس میں اس نے تقریباً ہر ملازمین کی فائل چیک کر لی تھی اور جن ملازمین سے وہ مطمئن نہیں تھی. ان کو اس نے فوراً ہی فارغ کر دیا تھا. وہ بزنس کے معاملے میں بہت باریک بین تھی۔

NEW ERA MAGAZINE .com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

ملک صاحب کے مینیجر علایا کے اس رویے سے ناخوش تھے، کیونکہ وہ ان کے کسی مشورے کو نہیں مانتی تھی. اسے جو ٹھیک لگتا وہ وہی کرتی، اب چاہے اس میں نقصان ہی کیوں نہ ہو۔

وہ اس وقت ایک ہاتھ سے اپنا سر پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے لیپ ٹاپ کے ٹچ پیڈ پر انگلی پھیر رہی تھی۔

مطلوبہ ویب سائیڈ پر کلک کرتے ہی وہ چند لمحے رکی۔۔

لوڈنگ۔۔۔۔۔۔

ویب سائیڈ کھلی تو وہ نہایت تحمل سے پڑھنے لگی. ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے کہ اس کی آنکھیں حیرانی سے پھیل گئیں. وہ فوراً ہی سیدھی ہو کر بیٹھی اور اپنی کرسی مزید آگے کی. چہرے کو اسکرین کے بلکل قریب کر کے اس نے دوبارہ اسی حیرت سے پڑھا۔

وہ جیسے بے یقینی کے عالم میں چلی گئی تھی. اسے خود کو اس کیفیت سے نکالنے میں کچھ لمحے لگے تھے. وہ جھٹکے سے اٹھی. میز پر پڑا اپنا موبائل اٹھایا اور جھٹ کسی کا نمبر ملا کر کان سے لگایا۔

دوسری جانب شاید بیل جا رہی تھی. وہ بے چینی کے عالم میں یہاں وہاں ٹہلنے لگی۔

ہیلو.. ہیلو ڈیڈ... وہ تیزی سے بولی۔

میری بات سنیں.. اس نے ان کی بات کاٹی تھی۔

کیا آپ نے کوئی فارم بھرا تھا؟ وہ ٹہلتے ٹہلتے رکی تھی۔

ڈیڈ پہلے میری بات کا جواب دیں. وہ شاید اس سے کچھ اور ہی پوچھ رہے تھے. علایا جلدی سے چلتی ہوئی آفس کی دراز قد کھڑکیوں کے سامنے آئی اور وہاں سے سرمئی پردے ہٹائے. سورج کی چمکتی ہوئی روشنی اس کے چہرے پر پڑی تو اس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک نظر آئی تھی. اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو شاہراہ فیصل کی سیدھی سڑک پر گزرتی ہوئی گاڑیوں کے کچھ نہ پایا۔

ہاں ڈیڈ میں بہت خوش ہوں... وہ کافی اکسائیٹڈ تھی۔

جی ڈیڈ یہ تو ٹھیک ہے کہ ہمیں پروجیکٹ ملا ہے.. مگر ڈیڈ... میری خوشی کی وجہ یہ پروجیکٹ نہیں ہے. اس نے اپنی گردن نفی میں ہلائی تو اونچی پونی بھی ساتھ جھولنے لگی۔

ڈیڈ.... جاپان نے ٹوکیو میں ہونے والی ٹیکنالوجی ایگسیبیشن (ٹیکنالوجی کی نمائش) کے لئے ہماری انڈسٹری کے اونر کو انوائیٹ کیا ہے... اور آپ کو پتہ ہے کہ اس وقت اونر میں ہوں۔

وہ جلدی سے لیپ ٹاپ کے پاس آئی اور فوراً کرسی پر بیٹھ گئی. وہ ملک صاحب کی بات سن رہی تھی اور ساتھ ساتھ لیپ ٹاپ پر بھی کچھ سرچ کر رہی تھی۔

ڈیڈ... آپ جانتے ہیں ناں کہ جاپان ٹیکنالوجی میں کس حد تک آگے جا چکا ہے. وہاں دنیا بھر سے لوگ اپنے ملک کی ٹیکنالوجی کو پروموٹ کرنے آتے ہیں. یہ میرے لے بہت انٹرسٹنگ رہے گا. میں یہ نمائش دیکھنے ضرور جاؤں گی. وہ اٹل لہجے میں بولی۔

ڈیڈ... آپ نے مجھے کبھی جاپان نہیں جانے دیا لیکن اب میں جانا چاہتی ہوں... اور آپ مجھے روک نہیں سکتے.. ملک صاحب کے منع کرنے پر اسے جیسے غصہ آیا تھا۔

جی ڈیڈ؟ وہ شاید اسے کچھ کہہ رہے تھے۔

ہو سکتا ہے کہ آپ کے کسی مینیجر نے یہ فارم بھر دیا ہو..وہ حیرت میں تھی۔

سیریسلی ڈیڈ..اگر آپ نے یا آپ کے مینیجر نے یہ فارم نہیں بھرا تو یہ کس نے بھرا؟

وہ شاکڈ میں آ گئی تھی۔

لائن ڈسکنیکٹ ہوئی تو وہ کرسی سے اٹھی اور دوبارہ کھڑکیوں کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔سنہری رنگت والا چہرہ سوچ میں ڈوبنے لگا تھا۔

اگر فارم ڈیڈ یا ان کے مینیجر نے فل نہیں کیا تو تیسرا شخص کون تھا جس نے یہ فارم بھرا؟

اور اگر یہ فارم کسی نے بھرا ہی نہیں تو جاپان والے ان کی انڈسٹری پر اتنے مہربان کیوں ہوئے تھے؟

یہ کیا معاملہ تھا بھلا؟وہ عجیب شش و پنج میں گرفتار ہونے لگی تھی۔

ہو سکتا ہے کہ ڈیڈ نے اپنی بیماری سے پہلے یہ فارم بھرا ہو اور اب وہ مجھے روکنے کے لئے مجھ سے جھوٹ بول رہے ہوں..اس نے سوچا تھا۔

ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ہماری کمپنی کی رینکنگ کو دیکھتے ہوئے انھوں نے اس کے اونر کو انوائیٹ کیا ہو.یا پھر ایسا بھی ممکن ہے کہ انڈسٹری سے جڑی کسی کمپنی نے یہ فارم اپنے لئے بھرا ہو اور جاپان والوں نے کسی کمپنی کے بجائے انڈسٹری کے آنر کو انوائیٹ کیا

ہو۔

یکے بعد دیگرے سوالات اس کے ذہن پر ابھرنے لگے، پھر جیسے جاپان جانے کے خیال میں اس نے ان تمام خیالات کو جھڑکا تھا. پھر جیسے اسے اپنا خواب یاد آیا تھا جس کی تعبیر حقیقت ہونے والی تھی. ڈیڈ نے اسے کافی ملکوں کی سیر کرائی تھی، استنبول، امریکہ، سوئٹزرلینڈ، انگلینڈ، دبئ.. اس کے ہمیشہ سے پسندیدہ رہے تھے. جہاں جانے کا خواب اس نے دیکھا تھا وہ تھا "جاپان" اور جو وہ کرنا چاہتی تھی وہ تھا "جاپان کا سفر" جو کچھ ہی مہینوں میں شروع ہونا تھا۔

جو بھی ہے.. میں جاپان ضرور جاؤں گی.. اس نے خوشی سے ایک لمبی سانس اندر کھینچی. اس کی خوشی سے اس کی آنکھوں کی چمک ہی بدل گئ تھی۔

* * * * * * * * *

کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟ رات کے کھانے پر ملک صاحب اس سے گویا ہوئے۔

کھانے کی میز پر تقریباً ہر طرح کا کھانا رکھا تھا مگر ملک صاحب نے پلیٹ میں ذرا سے چاول نکالے تھے اور ملک صاحب بجائے کھانے کے پلیٹ میں صرف چمچہ ہلا رہے تھے۔

علایا نے اپنی پلیٹ میں چائینیز پلاؤ نکالا ہوا تھا جو وہ چمچے کی مدد سے کھانے میں مصروف تھی. چائینیز کھانا اس کا ہمیشہ سے ہی پسندیدہ رہا تھا۔

کافی دیر تک علایا کو سمجھانے کے بعد بھی اس کے کانوں پر کوئی جوں نہیں رینگی تھی. وہ بضد تھی. جاپان جانا اس کا خواب تھا اور چونکہ یہ خواب قسمت نے اس کی جھولی میں ڈال دیا تھا. وہ یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

ٹھیک ہے....اگر تمہارا یہی فیصلہ ہے تو میری بھی ایک شرط ہے. انھوں نے ہاتھ میں پکڑے کانٹے کو پلیٹ میں رکھا اور کرسی سے ٹیک لگائی۔

علایا کا منہ میں جاتا ہوا ہاتھ یکدم رکا۔

شرط؟ اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر آیا تھا۔

وہ میں تمہیں وقت آنے پر بتاؤں گا. انھوں نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔

ڈیڈ...جو بھی بات ہے ابھی کلئیر کر لیں. اس نے گردن نفی میں ہلائی تو کھلے ہوئے بال بھی جھولنے لگے. وہ اس وقت نک سک سے تیار ہو کر بیٹھی تھی. ہونٹوں پر لال رنگ کی لپسٹک لگی تھی. اس پر گلابند ہوئی لال فراخ پہنی تھی جو نیچے ٹخنوں تک آتی تھی. لمبے بال سائیڈ کی مانگ نکالے آگے کندھے پر آتے تھے. وہ شاید اس وقت کسی دعوت میں جا رہی تھی. علایا کا ہمیشہ سے ایک ہی اصول رہا تھا. وہ کہیں دعوت میں

جاتے وقت کھانا ہمیشہ گھر سے کھا کر جاتی تھی. اسے دوسروں کے گھر کھانا اچھا نہیں لگتا تھا. اسے اپنی عزت گھٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی. اگر ریستوران میں بھی کوئی انوائیٹ کرتا تو بھی وہ اپنا بل خود دیتی تھی. اسے لگتا تھا کہ تحفے، تحائف، دعوتیں یہ سب انسان کو خریدنے کے لئے دیا جاتا ہے اور وہ فروخت ہونا نہیں چاہتی تھی۔

ہال میں جگمگاتا ہوا خوبصورت فانوس ہلکی ہلکی ارتعاش پیدا کر رہا تھا. ہال کی جگمگاتی لائٹس میں وہ بلکل ایک شہزادی معلوم ہوتی تھی بس اس کے سر پر خوبصورت تاج کی کمی رہ گئی تھی۔

میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا.. وہ شانے اچکا کر بولے۔

ڈیڈ... مجھے اپنے سہارے کا عادی مت کریں.. میں اکیلے جانا چاہتی ہوں. میں اکیلے ہی کا پان کو ڈسکور کرنا چاہتی ہوں.. اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

یہ نہیں ہو سکتا... وہ اٹل لہجے میں بولی۔

دن بدن علایا ملک ایک خود غرض اور بے حس لڑکی بنتی جا رہی تھی اس بات کا اندازہ انھیں ہو گیا تھا. اپنے فائدے کے لئے دوسرے کو نقصان پہچانے کے خیالات اس کے ذہن میں آنا شروع ہو گئے تھے۔

کھاتے کھاتے جیسے اس نے اکتا کر کھانا چھوڑا اور فوراً ہی جانے کے لئے اٹھی۔

تمہیں کہیں جانا تھا؟

ڈیڈ... صبح آپ کو بتایا تو تھا کہ ایمن نے بارہ بجے کیک کٹ کرنا ہے. اس کی برتھڈے سیلیبریشن ہے. وہ سرسری سا بتانے لگی۔

ہاں مجھے یاد ہے لیکن ڈرائور تو گاؤں گیا ہوا ہے. وہ بھی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولے۔

میں چلی جاؤں گی. وہ جلدی سے کہہ کر فوراً ہی لاؤنج عبور کرتی ہوئی کارپورچ میں آئی۔

علایا... اکیلے مت جاؤ.. میں حبیب اللہ کو بلا لیتا ہوں. وہ تمہیں چھوڑ دیگا. حبیب اللہ بھی ان کا ڈرائیور تھا جو اکثر علی شاہ کی غیر موجودگی میں آجایا کرتا تھا۔

ڈیڈ اسے آنے میں وقت لگے گا.. میں اکیلی چلی جاؤں گی. اس نے اکیلے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

رات کے اندھیرے میں بھی پورچ پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا. اس نے جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور گاڑی مین گیٹ سے باہر نکالی۔

ملک صاحب جو پورچ میں کھڑے اسے جاتا دیکھ رہے تھے اس کے جاتے ہی وہ بھی پلٹ کر اندر کی طرف آگئے. ڈائینگ ہال میں پہنچتے ہی ان کی نگاہ میز پر پڑے موبائل پر پڑی. یہ علایا کا موبائل تھا جو وہ جلد بازی میں بھول گئی تھی. ایک نئی پریشانی ان کے

چہرے پر ظاہر ہونے لگی تھی۔

* * * * * * * * * *

ملک صاحب اپنے کمرے میں پریشانی کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔علایا موبائل بھول گئی تھی اور وہ اس سے کسی صورت کانٹیکٹ نہیں کر پا رہے تھے. اسے گھر سے نکلے ہوئے ایک گھنٹہ ہو گیا تھا. یکدم ہی علایا کا موبائل بجا تو انھوں نے فوراً اسکرین کو دیکھا۔ ایمن کالنگ۔۔۔۔

انھوں نے جلدی سے فون اٹھایا۔

ہیلو علایا ۱۲ بجنے والے ہیں... کہاں ہو تم؟؟ وہ تیزی سے بولی۔

ملک صاحب کی پریشانی اب خوف میں بدلنے لگی. یکدم ہی ان کا وجود سن ہو گیا تھا۔

کیا علایا اب تک نہیں پہنچی؟ اسے یہاں سے نکلے ہوئے ایک گھنٹہ ہو گیا ہے. انھیں اپنی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

ملک صاحب کی آواز سنتے ہی ایمن نے انھیں سلام کیا پھر علایا کے نا پہنچنے کی اطلاع دی۔

لائن کٹی تو ملک صاحب کی پیشانی پسینے سے شرابور تھی. انھیں اپنے سامنے کسی کا سایہ

بنتے ہوئے محسوس ہوا تھا. انھوں نے اسے نیچے سے اوپر دیکھا تو اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر وہ یکدم ہی کانپ اٹھے تھے. اپنا وجود انھیں ہولے ہولے ہلتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

"ملک...ماضی میں کئے گئے گناہ مستقبل میں پچھتاوے کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔

اس نے ان کا نام لے کر انھیں مخاطب کیا تھا۔

م..میں نے کچھ نہیں کیا.... وہ اس سے نظریں چراتے ہوئے بولے۔۔

بائیس سال ہو گئے یہ جملہ سنتے ہوئے، اور کب تک چھپاؤ گے ؟ وہ یکدم ہی ہنسا تھا۔

ملک صاحب نے فوراً اپنی پیٹ موڑی تھی وہ اس شخص کو مزید نہیں دیکھنا چاہتے تھے، مگر اب اس کا عکس ملک صاحب کو شیشے میں بنتا ہوا محسوس ہوا تھا. وہ ان کے بلکل پیچھے تھا۔

ایک دن راز افشاں ہو جائیں گے اور تمہارے ہاتھ میں صرف کنکر ہونگے جس سے " تم خود کو پیٹ رہے ہو گے. دھوکہ صرف تب تک دیا جا سکتا ہے جب تک سامنے والا اپنی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی نا اتار دے. "اس لمبے اور صحتمند آدمی نے ان کے کان میں آہستہ سے کہا تھا. ملک صاحب کا دل بیٹھنے لگا۔

میں اپنے گناہوں کی سزا علایا کو نہیں بگھتنے دوں گا. میں وقت آنے پر اسے سب کچھ سچ

سچ بتادوں گا. یہی چاہتے ہو نا تم؟ میں اسے اپنے جیسا خود غرض نہیں بننے دوں گا. وہ اس کی طرف پلٹے تھا۔

پھر شاید میرے دل کا بوجھ کچھ کم ہو سکے. وہ آہستہ سے بولے۔

وہ جانتے تھے کہ بائس سال سے انھیں نظر آنے والا یہ شخص ان سے کیا چاہتا تھا۔

انھوں نے اٹل فیصلہ کیا تو وہ فوراً ہی غائب ہو گیا. وہ جانتے تھے کہ یہ کام بہت مشکل ہے۔

کیا علایا اس سچ کو برداشت کر پائے گی؟؟

وہ میرے بارے میں کیا سوچے گی؟

اگر سچ جاننے کے بعد وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی تو؟؟

میں اس کے بغیر کیسے رہوں گا؟

جب جب وہ اسے سچ بتانا چاہتے تب تب یہ سوالات ان کے ذہن پر ابھرنا شروع ہو جاتے. وہ چاہ کر بھی اسے سچ نہیں بتا سکتے تھے۔

ملک صاحب نے جلدی سے بیڈ پر پڑا اپنا موبائل اٹھایا اور فوراً ہی پولیس کو کال ملادی.

پھر اگلے ہی لمحوں میں انھوں نے سائیڈ ٹیبل سے گاڑی کی چابی اٹھائی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے تیزی سے باہر آ گئے۔

* * * * * * * * *

اس کی گاڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی. اسے میکسی وغیرہ پہننے کا کوئی شوق نہ تھا مگر چونکہ آج کل نوجوانوں کی برتھڈے تھیم کے بغیر ادھوری ہوتی ہے. ایمن نے بھی اپنی برتھڈے کے لئے بلیک اور ریڈ تھیم منتخب کیا تھا. لڑکوں کو بلیک کوٹ پینٹ اور لڑکیوں کو ریڈ میکسی میں ہی داخل ہونے کی اجازت تھی. یہ تقریب کراچی کے سب سے خوبصورت اور مشہور ریستوران کولاچی میں رکھی گئی تھی. بہت سے بہت پینتیس منٹ کے اندر اندر اسے وہاں پہنچنا تھا. چونکہ کراچی جیسے بڑے شہر میں تقریبات رات دیر سے شروع ہوتی ہیں تو وہ رات ۱۱ بجے کے قریب گھر سے نکلی تھی. ایمن نے کیک ٹھیک بارہ بجے کٹ کرنا تھا اور یہ پارٹی رات دیر سے ختم ہونی تھی. اسے کونسا وہاں کچھ کھانا تھا. اسے تو صرف ایک فارمیلٹی پوری کرنی تھی۔

تقریباً پندرہ منٹ کی ڈرائیو کے بعد اس کی گاڑی اس سنسان روڈ پر آگئی تھی جہاں دور دور تک اسے لوگ نظر نہیں آرہے تھے. نا جانے یہ کونسا روڈ تھا جو اتنا سنسان پڑا تھا. یہ کلفٹن کا روڈ تھا جو کافی سنسان ہوتا ہے. ہلکی ہلکی روشنی دور دور فلیٹوں سے نظر آتی تھی. باقی اس روڈ پر دونوں اطراف بڑے بڑے درخت ہی نظر آتے تھے. روشنیوں

کا شہر کہلانے والا کراچی کا یہ علاقہ کافی تاریک تھا. شاید بے دھیانی میں اس نے گاڑی کسی غلط روڈ سے نکالی تھی. وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس سنسان روڈ کو دیکھ رہی تھی. وہ انھیں سوچوں میں تھی کہ اچانک ایک جھٹکے سے اس کی گاڑی رکی تھی. اس نے گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی مگر بے سود. شاید گاڑی میں کوئی ٹیکنکل مسئلہ ہوا تھا. وہ فوراً گاڑی سے باہر آئی. وہ مکینک نہیں تھی جو گاڑی کو ٹھیک کرتی۔

افف...اس کو بھی ابھی خراب ہونا تھا... لعنت ہو علی شاہ تم پر.. خراب گاڑی کو کھڑا کر کے گئے ہو. اس نے ڈرائیور کو کوستے ہوئے کوفت سے ایک لات گاڑی پر ماری۔

پھر جیسے کسی خیال کے تحت فوراً گاڑی کا دروازہ کھولا اور اپنی آنکھیں مزید پھاڑ کر اپنے ہاتھوں سے سیٹ پر کچھ ٹٹولا پھر جیسے کچھ نظر نا آنے پر گاڑی کی لائٹ آن کی اور پوری گاڑی میں ایک نظر دوڑائی. ہوا کے تیز جھونکے سے اس کے کھلے بال یکدم ہی منہ پر آئے تو اکتاہٹ سے اپنی دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے انھیں کان کے پیچھے اڑسا۔

اوہ گاڈ....میرا موبائل..اس نے اپنے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

کیا کروں؟اس نے آسمان کو دیکھا تو چمکتا ہوا چاند اسے ہی دیکھ رہا تھا. اس نے گاڑی کا دروازہ زور سے بند کیا اور غصے سے یہاں وہاں ٹہلنے لگی. اتنے ویرانے میں صرف اس کی ہیلز کی آواز ہی سنائی دیتی تھی. پاس سے اکا دکا گاڑیاں گزرتی تھیں مگر وہ علایا ملک

تھی جو کسی سے لفٹ لینا پسند نہیں کرتی تھی. کچھ ہی دیر میں اتنا ویرانہ سناٹا دیکھ کر اس نے گاڑی میں بیٹھنا ہی مناسب سمجھا. وہ گاڑی میں بیٹھی تو پھر اس نے اپنی گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوششیں شروع کر دیں مگر ناکام رہی. سرخ میکسی میں اس کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا تھا. اسے اپنے ڈرائیور پر شدید غصہ آرہا تھا۔

یااللہ اب تو ہی کسی کو مدد کے لئے بھیج دے. اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا. پھر گاڑی سے باہر آئی اور گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگائے کھڑی ہو گئی. ہوا تیزی سے آتی اور اس کے بالوں کو پیچھے کی طرف اڑاتی. اکا دکا لوگ گزرے بھی مگر اسے کھڑا دیکھ کر آگے چل دیتے۔۔

میں کوئی بلا تھوڑی ہوں جو سب دیکھ کر آنکھیں بند کر رہے ہیں. کوئی مدد کے لئے نہیں آرہا. ہونہہ... وہ منہ بنا کے بولی۔

مگر اس لال میکسی میں وہ کسی بلا سے کم بھی نہیں لگتی تھی. چاند کی پوری روشنی اس پر پڑ رہی تھی جس سے اس کے چہرے کی خوبصورتی مزید بڑھ گئی تھی۔

اس نے گردن موڑ کر انی بائیں طرف دیکھا جہاں اسے کسی کی آہٹ محسوس ہوئی تھی. وہ اسی سوچ میں ڈوبی تھی کہ اچانک وہ ایک جھٹکے سے ہلی تھی. اس نے اسے دیکھ کر اپنے دل پر ہاتھ رکھا اور چند گہری گہری سانسیں لیں. ایک بلی بھاگتی ہوئی درخت سے

نکل کر آئی اور بھاگتی ہوئی دوسری طرف چلی گئی۔

وہ اس بلی سے خوفزدہ ہوئی تھی۔

انھیں لمحوں میں پیچھے اسے اپنی گردن پر کچھ گڑھتا ہوا محسوس ہوا تھا. بغیر آہٹ کے کوئی اس کے پیچھے کھڑا تھا. اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا. اس نے آہستہ سے گردن موڑی تو آنکھیں خوف کے مارے مزید پھیل گئی تھیں. یک لمحے اسے اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں. اس کے سامنے کا منظر کافی خوفناک تھا جو اس نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔

سامنے کھڑے دو شخص کافی صحت مند تھے. دونوں نے اپنا چہرہ رومال سے چھپایا ہوا تھا اور اس میں سے ایک کے ہاتھ میں پسٹل تھی جو اس نے علایا کے ماتھے پر ٹکا دی تھی۔

ک..ک..کون ہو تم؟ وہ بمشکل بولی تھی. اسے اپنے دل کی دھڑکنیں اتنی تیز لگی تھیں کہ اسے یوں لگا تھا کہ اس کا دل باہر نکل کر آنے والا ہے۔

زاویار سکندر کے سامنے شیرنی بننے والی علایا اس چھوٹی پسٹل کے آگے بھیگی بلی بن گئی تھی۔

جو کچھ بھی ہے سب نکال دو....اس نے اپنی پسٹل زور سے اس کے ماتھے میں گاڑی

تھی۔

تم مجھے.... جانتے نہیں ہو.....م...میں...ع..علایاملک ہوں...وہ اٹکتے ہوئے بولی۔

تو کوئی بھی ہو..ہمیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا...جلدی کر لڑکی ورنہ اس پسٹل کی ساری گولیاں تیرے بھیجے میں اتار دوں گا...وہ زور سے دھاڑا تھا۔

ہیلپ، ہیلپ.....وہ زور سے چیخی تھی۔

ایک لڑکا جو موٹر سائیکل پر آرہا تھا علایا کو لگا وہ اس کی چیخ سن کر اسے بچالیگا مگر دوسرے کی موت کون اپنے سر لیتا ہے؟قریب پہنچنے پر اس نے اپنی گاڑی کی اسپیڈ مزید تیز کی اور بنا اسے دیکھے تیزی سے موٹر سائیکل بھگاتا ہوا لے گیا جیسے اس نے کچھ دیکھا ہی نہ ہو۔۔۔

کیا اللہ نے اس کیلئے مدد کے تمام راستے بند کر دیئے تھے؟

کیا اس کے لے آج کوئی مسیحا نہیں آئے گا؟

کیا وہ واقعی اس شیطان کی قید میں چلی جائے گی؟

کہانیوں میں تو شہزادے ہوتے ہیں جو شہزادی کو ظالم دیو کی گرفت سے بچا لیتے ہیں.

مگر وہ حقیقت کی دنیا میں تھی جہاں نا کوئی شہزادہ تھا اور نہ اس شہزادی کے پاس کوئی

جادوئی چھڑی تھی جسے گھما کر وہ انھیں پتھر کا مجسمہ بنا دیتی. وہ کیا کرے اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

اس کے چیخنے پر اس آدمی نے اسے گدی سے پکڑا اور پسٹل اس کی کنپٹی پر رکھ دی. وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی. اس کا پورا وجود اسے ریت کی مانند پھسلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا. اسے زندگی میں پہلی بار خوف آیا تھا، موت کا خوف۔

بے حس لوگ... اللہ تعالی یہ ہیں آپ کے بندے؟ آپ نے ان کے لئے دنیا بنائی؟ اس کے دل نے پہلی بار اللہ سے شکوہ کیا تھا کیونکہ اللہ نے اسے کبھی موقع ہی نہیں دیا تھا۔

NEW ERA MAGAZINE .com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی تھی۔

استاد یہ سب کو جمع نہ کر لے اس سے پہلے بھاگ لو.. دوسرا آدمی اسے ذرا ڈرپوک معلوم ہوا تھا۔

میرے پاس..... کچھ بھی نہیں ہے... وہ بمشکل بولی تھی۔

استاد میں تو کہتا ہوں یہ اتنی پیاری ہے، اسے ہی ساتھ لے چلتے ہیں. دوسرے نے اپنی جانب سے بڑی عقلمندانہ بات کہی تھی۔

علایا کا دل بجھنے لگا تھا اس نے اپنی گردن نفی میں ہلائی تھی۔

نن...نن....نہیں....پلیز مجھے چھوڑ دو...مجھے جانے دو....میری گاڑی لے جاؤ...

اس نے پہلی بار کسی سے التجا کی تھی۔

ایسا موقع بار بار نہیں آتا...گاڑی میں بیٹھو...اس نے آہستہ سے کہا اور زور سے اس کا ہاتھ پکڑا تھا..وہ اسے لے کر گاڑی کی طرف بڑھنے لگا تھا۔

چھوڑو مجھے...علایا نے اس کا ہاتھ کاٹنا چاہا تھا مگر ناکام رہی. علایا کے نازک ہاتھ اس مضبوط آدمی کی گرفت میں تھے۔

علایا کے موٹے موٹے آنسوں جن کو وہ بہنے سے نہیں روک سکتی تھی اب سیلاب کی صورت اختیار کر گئے تھے. وہ اس وقت کو کوس رہی تھی کہ وہ رات کو اکیلی کیوں نکلی؟ اگر وہ اغوا ہو گئی تو اس کی کیا عزت رہ جائے گی؟ اس کی آنکھوں کے سامنے ملک صاحب کا چہرہ لہرایا...وہ اسے منع کر رہے تھے..وہ آدمی اسے کھینچتا ہوا گاڑی کے دروازے تک لے آیا تھا۔

لال میکسی، لال لپسٹک، شہزادی علایا، خوبصورت محل سب دھوئیں کی طرح اسے غائب ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے. بھری دنیا میں کوئی کیسے اکیلا ہوتا ہے یہ اسے آج پتہ چلا تھا. کوئی اس کی مدد کو نہیں آتا تھا. لاچاری اور بے بسی کی انتہا کیا ہوتی ہے یہ

اسے آج معلوم ہوا تھا. ملک ریاض کی بیٹی علایا ملک ہونے کے باوجود بھی وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

رونے سے اس کی آنکھوں کا کاجل اور مسکارا بہہ کر نیچے کی طرف آگیا تھا۔

اس تندرست آدمی نے علایا کو گدی سے پکڑا اور گاڑی میں بٹھایا. گاڑی میں بیٹھتے وقت اس کا سر بری طرح دروازے سے ٹکرایا تھا. اس کے سر پر چوٹ آئی تھی جس سے ہلکا ہلکا خون رسنے لگا تھا. وہ خود گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھا. دوسرے بندے نے جلدی سے پیچھے کا گیٹ کھولا۔ جیسے ہی وہ ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آیا تو ایک جھٹکے سے کراہتے ہوئے پیچھے ہٹا. کوئی بڑی سی نوکیلی چیز اس کے سر سے ٹکرائی تھی. اس نے اپنے سر کو پکڑا اور بری طرح چیخا.. اگلے لمحے دوبارہ کوئی چیز اس کے سر سے ٹکرائی اور اس بار وہ زمین پر لوٹنے لگا تھا. اس کا دوسرا ساتھی اسے بلبلاتا دیکھ کر گاڑی سے باہر آیا تو یہی معاملہ اس کے ساتھ بھی طے پایا۔

علایا تیزی سے گاڑی سے باہر آئی. وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ کبھی اللہ سے کوئی دعا نہ مانگنے والی علایا کی دعا اللہ نے لمحوں میں سنی تھی اور اس کے لئے ایک مسیحا بھیجا تھا. وہ گاڑی سے اتر کر ننگے پاؤں لڑکھڑاتی ہوئی بھاگی، تو وہ گاڑی کے پیچھے سے نکل کر آیا. وہ بے دھیانی میں بری طرح اس سے ٹکرائی تھی. اس نے

روتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا تو اس کی آنکھیں حیران تھیں. اس کے سامنے کھڑے اس شخص نے ہوڈی پہن رکھی تھی. اس نے اپنا سر کیپ سے ڈھکا ہوا تھا. وہ یقیناً اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا کوئی مسیحا تھا جو خضر کی طرح وقت پر پہنچا تھا. اس نے علایا کو دیکھ کر اپنا کیپ اتارا. علایا نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا تھا، اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ مسیحا زاویار سکندر تھا جسے اللہ نے اس کی مدد کے لئے بھیجا تھا. کراچی کی پوری عوام کو چھوڑ کر زاویار سکندر ہی اس کی مدد کو کیوں آیا تھا؟ وہ اس وقت کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

تو نے یہاں آکر اپنی موت کو دعوت دی ہے. اس کی آواز پر علایا نے اس آدمی کی طرف دیکھا۔

وہ دونوں آدمی کراہتے ہوئے اب کھڑے ہو گئے تھے. اس نے اپنی پسٹل زاویار پر تانی ہوئی تھی اور فاصلہ نہایت ہی کم تھا تو اب اس گولی کا نشانہ زاویار سکندر کا سینہ تھا۔

شاید زاویار سکندر علایا کی موت مرنے آیا تھا۔

* * * * * * * * *

ردا اس وقت لان میں موجود ایک سنگی بنچ پر بیٹھی تھی۔ زرا سا فاصلے پر سوئیمنگ پول

بنا تھا۔وہ اپنی نظریں اس پول کے پانی پر مرکوز کئے ہوئے تھی. رات کے اندھیرے میں لان کی چند لائیٹس ہی جل رہی تھی۔اوپر آسمان پر تاروں کی ٹمٹماہٹ اور چاند کی خوبصورت روشنی نے آسمان کا حسن دوبالا کیا ہوا تھا۔

احمر نے اوپر اپنی کھڑکی کا پردہ کھولا تو لان میں ردا کو بیٹھے دیکھا. وہ اکیلی اور اداس بیٹھی تھی. رات کے وقت لان ذرا غیر محفوظ ہوتا تھا کیونکہ کوئی بھی باآسانی اندر کود کر آسکتا تھا. احمر نے اسے دیکھا پھر فوراً ہی سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا. وہ اس وقت نائٹ دریس پہنے ہوئے تھا۔

اکیلے بیٹھی کیا کر رہی ہو؟ وہ اپنے بالوں کو ہاتھوں کی مدد سے سنوارتے ہوئے بولا۔

اس کی آواز پر ردا بری طرح چونکی تھی. اس نے اپنی گردن موڑی تو وہ بلکل پیچھے کھڑا تھا. پھر گھوم کر اس کے برابر میں بینچ پر بیٹھ گیا۔

تم نے ڈرا دیا. وہ دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

تم اور ڈر جاؤ.... وہ ہنستے ہوئے بولا۔

ردا نے جامنی رنگ کی لانگ شرٹ پہنی تھی اور بالوں کو اس نے سائیڈ کی مانگ نکال کر کھلا چھوڑا ہوا تھا. اس کے بال ہوا سے اڑے تو احمر کے چہرے سے ٹکرائے۔

اونہوں.... یہ کیا تم نے بالوں کو کھولا ہوا ہے؟ چڑیل لگ رہی ہو. وہ غصے سے اپنے

چہرے پر سے اس کے بالوں کو ہٹاتے ہوئے بولا۔

تمہیں تو میں چڑیل ہی لگتی ہوں. اس نے اپنے بالوں کو سمیٹا اور ڈھیلا سا جوڑا بنالیا۔

یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ اس نے اپنا سوال دھرایا۔

بس یونہی... اس نے اپنی نظریں اوپر آسمان پر ٹکادیں۔

احمر نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا. اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔

میں سوچ رہی تھی کہ کیا مما پاپا کو معلوم تھا کہ ان کی زندگی اتنی کم ہو گی کہ وہ اپنی اولاد کو اپنی آنکھوں کے سامنے بڑھتا ہوا نہیں دیکھ سکیں گے؟ اس کی آواز میں درد تھا۔

تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟

یہ خیال ہمیشہ سے میرے ساتھ رہا ہے احمر۔۔

وہ اس کے چہرے کو نہیں دیکھ رہی تھی۔

کاش کہ اللہ انسان کو اس کی پیدائش کے وقت اس کی موت کا وقت بھی بتادیتا. اس طرح انسان کے اچانک بچھڑ جانے کا دکھ تو نہ ہوتا. ردا نے اپنی اداس آنکھوں سے اسے دیکھا۔

ردا اگر اللہ انسان کو اس کی موت کا وقت پہلے بتادیتا تو انسان ٹھیک سے دنیا میں جی بھی نہیں سکتا تھا. اگر ایسا ہوتا تو انسان ناامید ہی رہتا اور لمحہ لمحہ موت کو اپنے قریب آتا دیکھ

کر تڑپتا رہتا. اس نے اپنا رخ ردا کی طرف موڑ لیا تھا۔

دیکھو.. میں تمہیں ایک مثال دوں.. اس کے کہنے پر ردا اسے دیکھا۔

جب کسی مریض کو یہ معلوم ہوتا ہے نا کہ اس کے پاس چند مہینے یا چند دن باقی ہیں تو وہ مایوس ہو جاتا ہے. پھر وہ سوچتا ہے کہ زندگی کا اتنا مختصر سفر اس لئے طے کیا کہ اس کا اختتام موت تھا؟ مرنے والا اپنی موت کو قریب دیکھ کر رات دن روتا ہے، لمحہ لمحہ گنتا ہے، گھڑی کی ٹک ٹک اسے ہتھوڑے کی طرح اپنے کانوں پر پڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے کیونکہ وہ مرنے سے پہلے ہی موت کی اذیت کو سہہ رہا ہوتا ہے. وہ اسے سمجھانے والے انداز میں بولا۔۔

NEW ERA MAGAZINE .com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

وہ خاموش ہوا تو یکدم ہی لان میں خاموشی چھا گئی۔

احمر انسان کتنے خواب دیکھتا ہے، ہر وقت پلیننگ کرتا ہے کہ مستقبل میں اچھا گھر بنائے گا، یہ حاصل کرے گا، یہ کرے گا، وہ کرے گا. اسے لگتا ہے جیسے وہ دنیا میں ہمیشہ رہے گا. وہ شاید یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اسے کبھی موت نہیں آئے گی، لیکن موت اسے ایک لمحہ بھی نہیں دیتی۔

وہ پل بھر کو سانس لینے کو رکی. اس کی نظریں سامنے پول کے پانی پر مرکوز تھیں۔

احمر میں سوچتی ہوں انسان کی آخری سانس کتنی تکلیف دہ ہوتی ہو گی جب اسے اپنی

آنکھوں کے سامنے زندگی کی ڈور ٹوٹتی ہوئی نظر آتی ہو گی، اسکی کتنی ہی خواہشات اس کے ساتھ مٹی تلے دفن ہوتی ہو نگی جنھیں پورا کرنا اس انسان کی زندگی کا اولین مقصد ہوتا ہو گا۔

جو ہم چاہتے ہیں ویسا کیوں نہیں ہوتا احمر؟

اللہ انسان کو کسی نہ کسی شے سے محروم کیوں رکھتا ہے؟

ردا کی آنکھوں میں نمی تھی. اس نے اپنے گھٹنے موڑ کر اوپر بنچ پر رکھ لئے تھے. اپنے بازوؤں کو اس نے گھٹنوں کے گرد لپیٹا ہوا تھا۔

احمر خاموشی سے اسے سن رہا تھا. ردا ہمیشہ سے ان کے ساتھ رہی تھی مگر وہ جانتا تھا کہ اگر ردا کو سارے جہاں کی خوشیاں بھی دے دی جائیں پھر بھی وہ لوگ اس کے ماں باپ کی کمی پوری نہیں کر سکتے تھے۔

یہ دنیا کی زندگی تو صرف اور صرف آزمائش ہے ردا. یہاں کسی کو بھی کچھ حسبِ آرزو نہیں ملتا. میں تمہیں بتاؤں جب میں باہر کسی چھوٹے یا بڑے کو اپنے آگے ہاتھ پھیلائے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے. میں سوچتا ہوں کہ کیا ان لوگوں کا دل نہیں چاہتا ہو گا کہ یہ بھی ہم امیروں کی طرح اچھی زندگی گزار سکیں؟ اللہ نے انھیں دولت سے محروم رکھا ہے۔

پھر مجھے ایک حدیث یاد آتی ہے تو دل پر سکون ہو جاتا ہے. وہ دھیمہ سا مسکرایا۔

کونسی حدیث؟ ردا نے سولیہ نظروں سے پوچھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''فقیر و محتاج مسلمان جنت میں مالداروں سے چالیس سال پہلے داخل ہوں گے''۔

یعنی اس دنیا میں کسی شے سے محروم ہونے والا اس دنیا میں اجر پائے گا۔۔

کبھی کبھی محرومی بھی کسی نعمت سے کم نہیں ہوتی. وہ بولتے بولتے رکا تو ردا اسے ہی ریکھ رہی تھی جو رات کے اس پہر بھی کافی فریش لگ رہا تھا. اس کی تمام باتیں ردا کے دل میں اتر رہی تھیں. وہ کتنا پیارا بولتا تھا۔

NEW ERA MAGAZINE .com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

اللہ کسی کو دے کر آزماتا ہے تو کسی سے لے کر آزماتا ہے. تمہیں پتہ ہے اچھا انسان وہی ہے جو اس کے فیصلوں پر راضی ہوتا ہے. ویسے بھی ہم مسلمانوں کو اللہ کی رحمت سے مایوس نا ہونے کا حکم دیا گیا ہے. یاد رکھو دنیا میں تم جس شے سے محروم رہی ہو، جنت میں وہ تمہیں ضرور عطا کی جائے گی۔

رات آہستہ آہستہ مزید گہری ہونے لگی. اس ٹھنڈی اور پر سکون ہوا میں نا جانے وہ کتنی ہی دیر تک باتیں کرتے رہے. ردا کا اداس دل آہستہ آہستہ سمجھنے لگا تھا. انھیں یہاں بیٹھے کافی دیر ہو گئی تھی. احمر کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔

مجھے اب نیند آرہی ہے... وہ بینچ سے اٹھتے ہوئے بولا اور ساتھ ہی منہ پر ہاتھ رکھ کر ایک لمبی جمائی لی۔

اب تم بھی یہاں سے اٹھو اور کمرے میں جاؤ۔

ردا نے اسے گردن اٹھا کر دیکھا تو اس کے آدھے دھڑ پر چاند کی روشنی پڑ رہی تھی۔

اسے جمائی لیتا دیکھ کر ردا کو بھی جمائی آئی. اس نے بے اختیار منہ پر ہاتھ رکھا۔

جنت میں تم اپنی مما اور ڈیڈی کے ساتھ جنت کے خوبصورت محل میں رہ لینا. اس نے اسے بلاوجہ چھیڑا تھا۔

ہاں... جیسے تم مجھے وہاں سکون سے رہنے دو گے؟ وہ منہ بنا کے بولی۔

ہاں... یہ تو ہے... میں نے تمہارا پیچھا وہاں بھی نہیں چھوڑنا.. احمر کھلکھلا کر ہنس پڑا.

ردا بھی اسے دیکھتے ہوئے ہنسنے لگی۔

* * * * * * * * *

زاویار سکندر اس وقت رف سی جینز اور ہلکی سی ٹی شرٹ پہنے اپنے اپارٹمنٹ کے کمرے میں موجود تھا. اس کے پاس کرنے کو کچھ نہ تھا تو وہ بیڈ پر لیٹا اپنی چھت کر گھور

رہا تھا۔

ذہن میں ماں باپ کا چہرہ بننے لگا تو اپنی پوری زندگی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی۔

اسے اپنا بچپن یاد آیا تھا کہ کیسے وہ آٹھ سال کی عمر میں اپنی ماما کے لئے روز باغ سے ایک پھول توڑ کر لاتا تھا. باغ کا مالی اسے روز ڈانٹتا مگر وہ روز ایک ہی بات کہتا۔

"میں تم سے نہیں ڈرتا...اپنی ماما کے لئے ایک کیا...میں تمہارے باغ کے سارے پھول توڑ دوں گا.." وہ شرارت سے کہتا ہوا بھاگتا تھا،

کیسے اس کے ماما پاپا اسے روز اسکول چھوڑنے جاتے تھے، کیسے وہ اپنے پاپا کے ساتھ مل کر خراب گاڑی کو ٹھیک کرتا. اس کے پاپا کافی اچھے مکینک بھی تھے. گھر کے بورڈ، پنکھے، مشین کچھ بھی خراب ہوتا تو وہ خود ہی اسے ٹھیک کر دیتے. زاویار ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ ٹول باکس پکڑے کھڑا ہوتا۔

پاپا یہ آپ نے کس سے سیکھا ہے؟ ایک دن وہ گھر سے باہر کھڑی گاڑی کو ٹھیک کرنے میں مصروف تھے تو وہ یونہی ان کے پاس آ گیا تھا. وہ اس وقت تقریباً تیرہ چودہ سال کا پیارا سا لڑکا تھا. بالوں کو اس نے کافی اسٹائل میں بنایا ہوا تھا۔

"بیٹا ضروری نہیں کہ چیزیں ہمیشہ سیکھنے سے ہی آئیں، کچھ چیزیں انسان کو صرف دیکھنے سے بھی آجاتی ہیں۔"

وہ ٹھنڈا پانی گاڑی کے گرم انجن پر انڈیلتے ہوئے بولے۔

تمہیں پتا ہے زاویار جب تمہارے دادا اپنی چیزیں ٹھیک کر رہے ہوتے تھے تو میں بھی ان کے پاس ایسے ہی کھڑا ہوتا تھا، جیسے تم میرے پاس کھڑے ہوتے ہو. انھوں نے زاویار کو مسکرا کر دیکھا تھا. وہ بلکل زاویار کی کاپی تھے. وہی آنکھیں، وہی اسٹائل میں بنے ہوئے بال اور بلکل ویسے ہی جسامت بھی۔

پاپا... آپ کو پتہ ہے؟ میں نے کل اپنی سائیکل خود ہی ٹھیک کر لی... وہ اکسائٹمنٹ میں بتانے لگا تھا۔

انھوں نے پانی کی بالٹی سے ڈونگا بھرا اور زاویار کو پکڑا دیا. اس نے آہستہ آہستہ پانی ان کے ہاتھوں پر ڈالا تو ہاتھ پر لگی کالک بھی دھلنے لگی۔

زاویار کی اکسائٹمنٹ کو دیکھتے ہوئے سکندر نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے شاباشی دی۔

وہ انھیں خیالوں میں گم تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی. دروازے پر ہونے والی دستک اسے ماضی کی یادوں سے نکال کر اس زندگی میں لے آئی تھی جہاں اس کے آس پاس کوئی نہ تھا۔

ماضی سے باہر آتے ہی زاویار نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

کمرے کے دروازے پر بوڑھے سے خانساماں کھڑے تھے۔

بیٹا کیا سو گئے تھے؟طبعیت تو ٹھیک ہے؟کب سے دروازہ بجا رہا ہوں. وہ پریشانی کے عالم میں بولے۔

آنکھ لگ گئی تھی میری.. وہ مسکراتے ہوئے بولا پھر کمرے سے باہر آگیا۔

ہاتھ منہ دھولو... کھانا تیار ہے.. وہ آواز لگاتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئے۔

زاویار جلدی سے واش بیسن کی طرف بڑھا. صابن سے ہاتھ دھو کر اس نے پانی کے چھپکے منہ پر مارے پھر سامنے لگے آئینے میں اپنا عکس دیکھا. اسے لگا وہ اپنے پاپا کو دیکھ رہا ہے. وہ آئینے میں دیکھتا ہوا دھیمے سے مسکرا دیا۔

اس نے تولیہ سے منہ پونچھا پھر کچن کی طرف بڑھ گیا. چھوٹی سی ٹیبل کے ساتھ دو کرسیاں جو کچن میں ہی رکھی تھیں،اس نے آگے بڑھ کر ایک کرسی کھینچی پھر اس پر بیٹھ گیا۔

میں نے تمہاری پسند کا چائنیز کھانا بنایا ہے. وہ گرم گرم کھانے کی ڈش میز پر رکھتے ہوئے بولے. کھانے سے اٹھتی ہوئی دلفریب مہک نے اسکی بھوک مزید بڑھا دی. اس نے تسلی سے پورا کھانا کھایا پھر کمرے کی طرف بڑھ گیا. کچھ ہی دیر میں باہر نکلا تو

شرٹ پر ہوڈی پہنی ہوئی تھی. اس کا دل عجیب بے چین ہو رہا تھا. اس نے ایک نظر بڑے پیار سے اپنے گھر کو دیکھا. پھر جیسے کسی خیال کے تحت دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں واک پر جا رہا ہوں... دروازہ بند کر لیں. اور گھر کا خیال رکھے گا... اس نے گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے خانساماں کو آواز دی۔۔۔

تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے پلٹ کر آؤ گے ہی نہیں. خانساماں خفا ہوئے تھے۔

زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا.. اور انسان کی زندگی تو ویسے ہی کسی بلبلے سے کم نہیں.. جس کا جی چاہتا ہے پھونک مار کر اڑا دیتا ہے." وہ مسکراتے ہوئے بولا اور تیزی سے باہر نکلا۔

خانساماں نے بڑبڑاتے ہوئے اس کے پیچھے دروازہ بند کر لیا تھا۔

اس کا چھوٹا اور خوبصورت فلیٹ ڈفینس کے ایریا میں تھا جہاں رات کے وقت کافی سناٹا ہوتا ہے۔

وہ یونہی پیدل چلتے ہوئے کافی دور آ گیا تھا. اتنا دور کے فلیٹس کی روشنیاں بھی کافی دور ہو گئی تھیں. وہ اپنے خیالات میں مشغول بس چلے جا رہا تھا. انھیں لمحوں میں اس نے احمر کو کال ملائی تھی، اسے احمر سے بات کرنے کا دل چاہ رہا تھا۔

اس نے لمحوں میں اس کی کال ریسیو کی تھی. احمر اور اسے اگنور کرے. یہ تو امپوسیبل تھا۔

احمر... آج میرا دل بہت اداس ہے. یوں لگتا ہے کہ میں تجھ سے بچھڑ جاؤں گا. زاویار کی آواز میں عجیب درد تھا۔

کیوں کیا وہ مغرور اور ہٹلر کی بہن علایا تجھ سے شادی کرنے کیلئے راضی ہو گئی جو تو مجھ سے بچھڑ جائے گا. وہ مذاق کے موڈ میں تھا۔۔

اگر میں بہت دور چلا جاؤں تو کیا کرے گا؟ اس نے اس کا سوال اگنور کیا اور دوسرا سوال پوچھا۔

NEW ERA MAGAZINE .com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

اگر تو میرے بغیر کہیں گیا تو یہ مت سمجھنا کہ میں تجھے چھوڑ دوں.. میں قیامت تک تیرا پیچھا نہیں چھوڑونگا.. میں تجھے ڈھونڈ لوں گا... احمر اسے دھمکیاں دے رہا تھا. زاویار اس کی باتیں سن کر بے ساختہ ہنس دیا تھا۔

احمر... میرا دل چاہتا ہے کہ سب کو چھوڑ کر وہاں چلا جاؤں جہاں سورج طلوع ہوتا ہے... وہ تیزی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا. شاید اللہ نے اسے علایا کی مدد کرنے کیلئے چن لیا تھا. اس لئے اس کے قدموں کا رخ بھی ٹھیک اسی روڈ پر موڑا تھا۔

تو کہاں ہے؟ میں تجھ سے ابھی ملنے آ رہا ہوں.. احمر کی آواز اس کے کانوں میں آئی تھی

زندگی رہی تو صبح ملیں گے دوست...اس نے اسے سمجھاتے ہوے رابطہ منقطع کیا۔

اب اس کا دماغ ماضی میں اور قدم تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے. چلتے چلتے وہ اس اندھیرے روڈ پر آگیا تھا جہاں رات کے وقت اسٹریٹ کرائم ہوتے تھے. وہ ہر شے سے بیگانہ تھا. اس کا ذہن ابھی بھی ماضی میں کھویا ہوا تھا. کیسے وہ اپنی ماما پاپا کے ساتھ پکنک پر جاتا تھا، ان کی زندگی کتنی پر سکون اور خوشی سے گزر رہی تھی. اس نے آس پاس کے گھنے درختوں کو دیکھا جو تاریکی میں ہوا سے جھول رہے تھے، بے خیالی میں اس سنسان روڈ پر وہ اپنے قدم بڑھاتا چلا گیا. اسے لگ رہا تھا کہ اس کی زندگی بھی اس اندھیرے جیسی ہے. تنہا، تاریک اور خاموش۔۔

ہیلپ.... ہیلپ.... جبھی اس تاریکی اور خاموشی میں کسی لڑکی کی آواز گونجی تھی.

اس نے ذرا فاصلے پر ایک گاڑی کے پاس کھڑی لڑکی اور دو آدمیوں کو دیکھا. اس کی چھٹی حس نے اسے فوراً ہی معاملے کی سنگینی سے اسے آگاہ کیا. اس نے لمحہ ضائع کے بغیر خود کو ان گھنے درختوں میں چھپایا... وہ لوگ اسے اتنے اندھیرے میں نہیں دیکھ سکتے تھے. وہ اکیلا تھا اور اسے ایک لڑکی کی عزت کو بچانا تھا. اس نے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور پولیس اسٹیشن کال کر کے انھیں اس صورتحال سے آگاہ کیا. مگر وہ جانتا تھا کہ

پاکستان میں پولیس کبھی بھی کرائم کی جگہ وقت پر نہیں پہنچتی. وہ پاکستان کی پولیس پر مکمل بھروسہ نہیں کر سکتا تھا. پولیس کے آنے سے پہلے اسے ان لوگوں کو روکنا تھا. وہ بغیر آہٹ کے آہستہ آہستہ ان کے قریب آگیا اور موقع دیکھتے ہی گاڑی کے پیچھے چھپ گیا. گاڑی کے پیچھے چھپتے ہی اسے اس لڑکی کی آواز آئی تھی. اس کے کان اس آواز کو پہچانتے تھے. وہ علایا ملک تھی. اسے اس وقت اس پر شدید غصہ آیا تھا. بھلا اتنی رات میں اسے اس سنسان علاقے میں آنے کی کیا ضرورت تھی؟

پاکستان کی ان لڑکیوں پر بھی ٹیکس لگنا چاہیئے جو رات کو تن تنہا نکلتی ہیں. وہ بڑبڑایا تھا۔

NEW ERA MAGAZINE .com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

وہ اس آدمی کے سامنے کتنی بے بس تھی وہ اچھی طرح سمجھ سکتا تھا. دراصل وہ اس آدمی کے سامنے بے بس نہیں تھی وہ تو اس چھوٹی پسٹل کے سامنے بے بس ہوئی تھی، جس کی نوک سے نکلنے والی ایک گولی اسے اس دنیا سے کسی اور دنیا میں پہنچا دیتی. وہ اس کی کیفیت کو سمجھ سکتا تھا. اسے ایک لمحہ علایا پر ہنسی بھی آئی تھی کہ اپنی حیثیت کا رونا رونے والی علایا اس وقت بے حیثیت اور بے مول تھی. وہ آدمی اسے گھسیٹتا ہوا کار کے دروازے کی طرف لا رہا تھا. وہ کسی کو مصیبت میں دیکھ کر کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔

اس کے پاس اس وقت ایسا کوئی ہتھیار نہیں تھا جس سے وہ ان کا مقابلہ کر پاتا. اس نے پریشانی کے عالم میں یہاں وہاں دیکھا تو باپ کی ایک نصیحت یاد آ گئی۔

"اگر مشکل وقت میں عقل سے کام لیا جائے تو اللہ کی بنائی ہوئی چھوٹی سے چھوٹی شے بھی تمہیں کامیابی تک پہچانے میں تمہاری راہ ہموار کرے گی، بس ایک شرط ہے کہ تمہیں مایوس نہیں ہونا۔"

ان کے لفظ کانوں میں گونج رہے تھے اور اس کی نظریں زمین پر کچھ تلاش رہی تھیں. جب ہی موٹے موٹے پتھر خوش قسمتی سے اسے نظر آ گئے. اس نے فوراً پتھر اپنی مٹھیوں میں بھرے. جس چیز پر اسے یقین تھا وہ تھی نشانہ بازی. اس نے بغیر سوچے سمجھے ہی ان پر پتھر برسائے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ تیر بازی اور نشانہ بازی میں وہ ہمیشہ سے پرفیکٹ رہا تھا۔

آدمیوں پر پتھر برسا کر وہ جیسے ہی وہاں سے نکلا تو علایا سے بری طرح ٹکرایا. اس نے علایا کو دیکھا تو اس کے چہرے پر خوف تھا. اس نے اسے دیکھ کر سر سے کیپ اتار دی۔

اتنی رات میں اکیلے نکلنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ غصہ ہوا تھا۔

علایا نے اسے دیکھا تو آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔

یہ کوئی جاپان یا پیرس نہیں ہے..جہاں کرائم ریٹ زیرو ہو..یہ پاکستان ہے علایا میڈم، یہاں ہر تیسری گلی میں لوگ تاک لگا کر بیٹھے ہوتے ہیں..اس کے چہرے پر غصے کے آثار نمایہ تھے۔

پہلی بار علایا اس کے سامنے خاموش کھڑی تھی. علاہا نے اپنی گردن نیچے کی تو ٹپ ٹپ آنسو زمین پر گرنے لگے. اسے لگا تھا کہ وہ گونگی ہو گئی ہے اور اب کبھی نہیں بول پائے گی۔

اچھا رونا بند کرو میں کچھ کرتا ہوں...اسے روتے دیکھ کر اسے دکھ ہوا تھا۔

تم نے میری وجہ سے اپنی جان کو خطرے میں کیوں ڈالا؟ وہ روندھی ہوئی آواز میں بولی۔

علایا اگر یہاں تمہارے علاوہ کوئی بھی لڑکی ہوتی تو بھی میں اس کی عزت کو محفوظ کرنے کی کوشش کرتا۔

اگر تیری بکواس ختم ہو گئی تو اب ہماری بھی سن لے...تو نے یہاں آکر اپنی موت کو دعوت دی ہے...وہ آدمی زور سے دھاڑا تھا۔

اب زاویار سکندر علایا ملک کے ساتھ کھڑا تھا اور ان کے نہایت قریب ہی وہ دونوں آدمی کھڑے تھے. اس آدمی نے اپنے ہاتھ میں پسٹل پکڑ رکھی تھی جس کا نشانہ زاویار

سکندر تھا۔

* * * * * * * * * * * *

زاویار نے پلٹ کر اس آدمی کو دیکھا پھر ایک لمبی آہ بھری۔

علایا ابھی بھی ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

زاویار نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اوپر کیا جیسے اس نے ہار مانی تھی۔

لڑکی کو ہمارے حوالے کرو اور جاؤ یہاں سے..اس نے پسٹل والے ہاتھ سے اسے

جانے کا اشارہ کیا۔

اس نے اپنے دو قدم آگے بڑھائے تو وہ پسٹل کے مزید قریب ہوا۔

ہمت ہے تو اس لڑکی کو یہاں سے لے جا کر دکھاؤ.اس کے ہاتھ ابھی بھی اوپر تھے۔۔

پولیس ابھی تک نہیں آئی تھی،اب وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

علایا کے باہر گرنے والے آنسو اب اندر حلق میں گرنے لگے تھے۔

کیسی پارٹی؟کونسی پارٹی؟اسے کچھ بھی یاد نہ تھا...یاد تھا تو بس اتنا کہ اس کی جان اور

عزت کو خطرہ تھا۔

کیا یہ مجھے بچا پائے گا؟

اس نے زاویار کو دیکھا تو اس کے کانوں میں اپنے الفاظ گونجنے لگے۔

جب وہ ملک صاحب کے پاس اپنی خواہش کے حصول کے لئے گئی تھی تو ڈیڈ نے اس سے پوچھا تھا کہ کیا چاہیئے؟

زاویار سکندر... وہ سوچتے ہوئے بولی تھی۔

ملک صاحب نے اسے بغور دیکھا تھا. اس کی آنکھوں میں نفرت، حقارت اور بے رحمی تھی۔

زاویار سکندر کی موت چاہتی ہوں.. اللہ کرے مر جائے وہ.. اس کی آنکھوں میں انتقام تھا۔

NEW ERA MAGAZINE .com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

ملک صاحب فوراً ہی بیڈ سے نیچے اترے تھے۔

اس کی موت سے کیا ملے گا تمہیں؟ وہ غصے سے بولے۔

سکون ملے گا... وہ عجیب لہجے میں بولی تھی۔

ڈیڈ اسے مروادیں، وہ ہر آئے دن میرے سامنے آجاتا ہے.. میری خوشیوں کا دشمن ہے، میری چیزیں چھینتا ہے.. اگر آپ نے اسے نہیں مروایا تو وہ کسی دن میرے ہاتھوں سے ضائع ہو جائے گا.. پتہ نہیں کیا سمجھتا ہے وہ خود کو؟

اس کی اس بات پر ڈیڈ نے اسے کتنا سمجھایا تھا اسے یاد تھا۔

زاویار کی موت کی دعائیں کرنے والی علایا اس وقت اس کی زندگی کی دعا کر رہی تھی.

کیوں؟ کیونکہ اس میں ابھی اس کا فائدہ تھا؟

کتنی کمظرف اور خود غرض ہوں میں... ہمیشہ اپنا فائدہ ہی سوچتی ہوں. وہ ابھی بھی اپنا فائدہ ہی سوچ رہی تھی۔

اور یہ کتنا اعلی ظرف اور بے غرض ہے، دوسروں کا نقصان بھی خود پر لے رہا ہے۔

یہ چاہتا تو میری کی ہوئی تمام بے عزتیوں کا بدلہ لے سکتا تھا، مگر اس نے میری وجہ سے اپنی جان کو اس خطرے میں کیوں ڈالا؟

دل و دماغ میں سوال و جواب کی جنگ جاری تھی۔

اگر کسی پر پسٹل تانو تو فاصلہ ذرا زیادہ رکھنا چاہیئے.. زاویار نے تیزی سے اپنی لات اس کے ہاتھ پر ماری تھی. پسٹل اندھیرے میں کہیں دور گری تھی۔

وہ آدمی یکدم ہی بوکھلایا تھا. اس نے اپنے خالی ہاتھ کو دیکھا تو غصے سے زاویار کو مارنے کے لئے آگے بڑھا. زاویار نے تیزی سے گھما کر اسے دوسری لات ماری تو وہ نیچے جا کر گرا۔

دوسرا آدمی بھاگتا ہوا آیا اور زاویار کو گلے سے دبوچا. زاویار نے اپنے کندھوں کو جھٹکا دیا

اور تیزی سے اس کے ہاتھوں کے نیچے سے گول گھوم کر اسے پیچھے سے پکڑا. اس نے اسے بالوں سے پکڑا اور زور سے اس کا سر کار کے دروازے پر لے جا کر پٹخا. دو تین پٹخے کھا کر ہی وہ بے حال ہو گیا تھا۔

علایا بے یقینی کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی. اس نے زاویار سکندر کا یہ روپ کبھی نہیں دیکھا تھا.. وہ کون تھا؟ وہ کیا تھا؟

نیچے گرے آدمی نے اسے پیچھے سے دبوچا تو اس نے اپنے ہاتھوں کی ساری طاقت لگا کر اس کے سر پر مارا. وہ آدمی بلبلا کر پیچھے ہٹا. زاویار نے تیزی سے اس پر دوسرا حملہ کیا تھا۔

علایا ملک نے زاویار سکندر کے ہاتھوں کو الگ طرح ہی چلتے دیکھا تھا. وہ اسے کوئی کراٹے ماسٹر لگا تھا۔

علایا کی نظریں اس پر ٹکی تھیں. اس کے لڑنے کا انداز اتنا پرفیکٹ تھا کہ اسے یہ کوئی عام انسان نہیں لگا تھا. اس نے اس آدمی کو بھی مار مار کر بے حال کر دیا تھا. وہ دور جا کر گرا تھا۔

دوسرا آدمی جو بے حال پڑا تھا اور اس کے سر سے بھی خون آ رہا تھا یکدم ہی اس کی نظر

پسٹل پر پڑی تھی. وہ گاڑی کے نیچے تھی. اس نے آہستہ سے کھسک کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور پسٹل اپنے دائیں ہاتھ میں تھام لی۔

کچھ ہی دیر میں وہاں فائر کی آواز گونجی تھی اور اگلے ہی لمحے علایا ملک سانس روکے بلکل شاکڈ کے عالم میں آگئ تھی. وہ اس وقت ایک پتھر کا مجسمہ بن گئ تھی. اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے گولی کو اس کے جسم میں پار ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔

زاویار.... اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا۔

زاویار نے پلٹ کر اسے دیکھا تو پہلی بار اس نے ان آنکھوں میں اپنے لئے ہمدردی دیکھی تھی۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے اپنے دائیں بازو کو تھاما ہوا تھا. علایا نے اس کے بازو کو دیکھا اس کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔

زمین اس کے خون سے رنگنے لگی تھی. وہ سانس ساکن کئے ہوئے اس کے ٹپکتے ہوئے خون کو دیکھنے لگی۔

زاویار کو اپنی پوری زندگی سلو موشن میں چلتی ہوئ محسوس ہوئ تھی. اسے احمر کا مسکراتا ہوا چہرہ یاد آیا تھا۔

ٹھا... ایک اور گولی اس کے سینے میں پیوست ہوئ تھی. زاویار نے اپنی آنکھیں درد

سے مینچیں تھیں. اسے یونی کا پہلا دن یاد آیا تھا جب اس نے اس لڑکی کو اپنی کار سے اترتے دیکھا تھا. وہ اسے بہت پیاری لگی تھی بلکل کسی شہزادی جیسی. وہ اپنا دل اس پر پہلے دن ہی ہار چکا تھا. وہ اسے بتانا چاہتا تھا.. لیکن علایا ملک کے اسٹیٹس تک پہنچنے کیلئے اسے بہت محنت کرنی تھی۔

اس کا وجود ڈھیلا پڑ رہا تھا. وہ لڑکھڑانے لگا تھا۔

تیز ہوا کے جھونکے نے زاویار کو زمین پر گرایا تھا. اس کے سارے خواب کرچی کرچی ٹوٹے تھے.. کیسا مرد تھا ایک لڑکی سے محبت کا اظہار تک نہ کر سکا... موت نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔۔

وہ زمین پر گرا پڑا تھا اور چاند ستارے اس کی موت پر حیران تھے۔

اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں، اس نے علایا کو ہمیشہ خود پر برہم ہی پایا تھا.. وہ اسے کبھی نہیں بتا سکا تھا کہ وہ... اس سے.... کتنی محبت کرتا ہے.. درد کی اس شدت میں بھی جو چہرہ اس کے ذہن پر لہرا رہا تھا وہ تھا علایا ملک کا چہرہ۔

"اگر قتل معاف ہوتا، تو تم سب سے پہلے میرے ہاتھوں قتل ہوتے." زاویار کے کانوں میں علایا کے الفاظ گونجے تھے۔ اس نے اس کے ہاتھوں قتل ہونے کے بجائے اس کے لئے قتل ہونا مناسب سمجھا تھا۔

اس نے آنکھیں کھولنا چاہیں، وہ اس دنیا سے جاتے وقت علایا ملک کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور اپنی موت سے ملنے والی خوشی کو دیکھنا چاہتا تھا۔

علایا ملک کی نفرت میں جینے والا زاویار سکندر علایا کی محبت میں مرنے لگا تھا۔

علایا نے اسے اپنی آنکھوں کے سامنے نیچے زمین پر پڑے ہوئے دیکھا تھا

وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا.. اس کا چہرہ آنسوؤں میں بھیگا تھا. چہرے پر دکھ، تکلیف اور بے بسی تھی۔

یہی تو چاہتی تھی وہ.. زاویار سکندر کی موت، اور جب اللہ نے اس کی زندگی کا سب سے بڑا کانٹا نکال دیا تھا تو اب وہ کیوں رو رہی تھی؟ اب اسے کیوں تکلیف ہو رہی تھی؟

وہ اس وقت دنیا کی ساری دولت لٹا کر صرف اسے ایک چیز سے بچانا چاہتی تھی. وہ تھی موت.. وہ زاویار سکندر کو اس کی موت سے بچانا چاہتی تھی۔

سچ ہے.. زندگی میں کسی کو قدر نہیں ہوتی، مرتے وقت سب اپنے اپنے آنسوں لے کر آجاتے ہیں. "کیا دو آنسو بہانے سے زندگی میں دیئے گئے دکھوں اور تکلیفوں کا ازالہ ہو سکتا ہے؟

اب وہ اسے کیوں بچانا چاہتی تھی؟

دوسرا آدمی جو زاویار سکندر کے کراٹوں کے باعث مدہوش تھا.. وہ ہوش میں آیا تو فوراً

ہی اٹھ کر اس آدمی کے پاس آیا جس کے ہاتھ میں پسٹل تھی۔۔۔

یہ کیا کیا تو نے؟ اگر یہ مر گیا تو قتل کا کیس ہو جائے گا. ہم یہاں قتل کرنے نہیں آئے تھے. وہ غصے سے چیخا تھا۔

"استاد اگر اس جیسے باہمت اور باعزت لوگ زندہ رہے تو ہم جیسے بے غیرت لوگوں کے دھندے کبھی نہیں چل پائیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی ایک اور گولی جو اس آدمی نے کھڑے ہو کر سیدھا اس کے دل پر ماری تھی. اس دل پر جس دل میں چار سال سے علایا ملک کی محبت پلی تھی۔

علایا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا تو زمین پر آس پاس خون تھا. زاویار سکندر نے سانس لینے کی کوشش کی. آخری چیز جو اس نے دیکھی تھی وہ علایا ملک کے وجود کو زمین پر گرتے ہوئے دیکھا تھا. پھر وہ سانس نہیں لے سکا تھا۔

* * * * * * * * * * * * *

اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو خود کو نامعلوم جگہ پر پایا. اس نے چھوٹی چھوٹی آنکھیں کھول کر کمرے کے چاروں اطراف میں نگاہ دوڑائی. یہ کمرہ کافی بڑا اور پر آسائش تھا. نرم و ملائم بستر پر لیٹے اسے پورا ایک دن گزر چکا تھا. اس نے اپنے سراپے پر نظر ڈالی تو

سرخ میکسی کے بجائے وہ ایک ڈھیلے ڈھالے گاؤن میں ملبوث تھی. اس کے سر پر پٹی بندھی تھی. وہ کہنیوں کے بل اٹھ کر بیٹھی تو سر میں درد کی ایک ٹیس اٹھی تھی. اس نے اپنے سر پر بایاں ہاتھ رکھ کر دبایا. اسے محسوس ہوا تھا کہ اس نے اپنا ہاتھ کسی گرم کھولتے ہوئے توے پر رکھ دیا ہو. وہ بخار میں جل رہی تھی. وہ اس وقت ہسپتال کے کمرے میں موجود تھی۔

اس نے اپنے پاؤں موڑے تو کمرے میں یکدم ہی ارتعاش پیدا ہوئی. اس نے اپنے پیروں کو دیکھا جس میں پازیب بندھی تھی. یہ سلور رنگ کی نازک اور خوبصورت پازیب تھی. وہ یونہی اپنے پیروں کو دیکھتی رہی پھر جیسے اس نے غور کیا تو صرف ایک پاؤں میں ہی پازیب بندھی تھی۔ وہ کافی حیرانی سے اسے دیکھتی رہی۔۔۔ اسے یاد تھا گھر سے نکلتے وقت اس نے پازیب نہیں پہنی تھی، پھر یہ اس کے پاؤں میں کیسے آئی؟ اس نے اپنی آنکھ بند کی تو یکدم ہی زاویار سکندر کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا. وہ زمین پر بے سدھ پڑا تھا. زاویار سکندر نے علایا کی عزت کو بچایا تھا مگر وہ اسے موت سے نہیں بچا پائی تھی. اس نے ایک جھٹکے سے اپنی آنکھیں کھولیں. اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے پہلی بار کسی کو مرتے دیکھا تھا. وہ یہ سب برداشت نہیں کر پائی تھی. وہ بے ہوش ہو گئی تھی. اس کے بے ہوش ہونے کے بعد وہاں کیا ہوا؟ وہ یہاں

کیسے پہنچی اسے کچھ معلوم نہ تھا. اس کے پاؤں میں یہ پازیب کس نے باندھی تھی؟

کیا زاویار سکندر واقعی نہیں رہا تھا؟

کیا وہ واقعی اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا؟

یا پھر اس نے کوئی خواب دیکھا تھا؟

دروازہ کھلا تو اس نے گردن اٹھا کر دیکھا. ملک صاحب اندر داخل ہو رہے تھے. وہ اسے دیکھ کر دھیما سا مسکرا دیے۔

ڈیڈ...زاویار کیسا ہے؟ اس نے ملک صاحب کو دیکھ کر فوراً سوال کیا۔

ملک صاحب کے قدم سست پڑے تھے. چہرے پہ مایوسی کے آثار نمایہ ہوئے۔

علایا....وہ یہاں سے بہت دور چلا گیا ہے. وہ افسوس کرتے ہوئے بولے. انھوں نے ایک لمبی آہ بھری تھی۔

آنسوؤں کی لڑیاں تیزی سے اس کی آنکھوں سے نکلی تھیں۔

ڈیڈ..وہ مجھے بچانے آیا تھا..وہ میری وجہ سے مر گیا..اس کی آواز روندھی ہوئی تھی۔

یکدم ہی انا پرست اور بے حس علایا کے دل میں زاویار کیلئے ہمدردی جاگی تھی۔

ملک صاحب نے حیران نظروں سے اسے کھوجا۔

علایا کوئی کسی کی وجہ سے نہیں مرتا،اس کی موت ایسے ہی ہونی تھی.اور تم یہ ہی تو چاہتی تھیں؟انھوں نے جیسے اسے یاد دلایا تھا۔

پتہ نہیں کیوں ڈیڈ۔۔۔۔۔میں کچھ سمجھ نہیں پارہی۔۔۔۔میرا دل بار بار اس خیال سے ڈوب رہا ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔کہ۔۔۔۔زاویار۔۔۔۔وہ یکدم ہی زور سے روئی تھی۔۔۔۔۔لفظ اس کے حلق میں پھنس گئے تھے۔۔۔ملک صاحب نے اس کا پورا جائزہ لیا تھا اور ان کے سفید بالوں نے انھیں اپنے تجربے سے آگاہ کر دیا تھا۔علایا ملک کا یوں رونا انھیں حیران کر گیا تھا۔

جبھی دروازے پر دستک ہوئی تو دونوں نے دروازے کی طرف دیکھا۔

وائٹ ڈریس پر وائٹ کوٹ پہنے نرس کمرے کے اندر داخل ہوئی۔

سر..وہ ملک صاحب کی طرف متوجہ تھی۔

علایا سے کوئی ملنا چاہتا ہے،اگر آپ اجازت دیں تو انھیں اندر بھیج دوں؟

ملک صاحب نے علایا کو دیکھا تو وہ اپنے آنسو صاف کر رہی تھی.علایا نے ہاں میں گردن ہلائی تو ملک صاحب نے بھی اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

نرس باہر گئی تو اگلے ہی لمحوں میں وہ اندر داخل ہوا. علایا نے اسے حیران اور پریشان نظروں سے دیکھا. وہ اس وقت پینٹ شرٹ پہنے ہوئے تھا اور اس کے بال بکھرے ہوئے تھے. وہ کافی غصے میں لگ رہا تھا۔

مل گیا تمہیں سکون؟ وہ کمرے میں آتے ہی دھاڑا تھا۔

احمر... وہ آہستہ سے بولی۔

کتنے پیسے دیئے تم نے ان آدمیوں کو؟ اس کی آنکھیں لال تھیں. وہ شاید بہت رویا تھا. اس کا تو زاویار کے بغیر ایک پل نہیں گزرتا تھا، وہ اس کے بغیر کیسے رہ سکتا تھا؟

تمیز سے بات کرو... ملک صاحب جو علایا کے پاس کھڑے تھے زور سے دھاڑے۔

بھاڑ میں جائے تمیز... میں یہاں تمیز سے بات کرنے نہیں آیا. اس نے شعلہ بار نظروں سے ملک صاحب کو دیکھا. وہ اپنے آپے میں نہیں لگتا تھا۔

علایا ملک میں تم پر کیس کروں گا.. تم نے میرے سامنے اسے قتل کی دھمکی دی تھی.... میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا.. تمہاری وجہ سے میں نے اپنا بھائی کھویا ہے.

وہ اسے تنبیہہ کرتے ہوئے بولا۔۔

علایا جو بیڈ پر بیٹھی تھی اس کی باتوں سے وہ فوراً نیچے اتری. اسے احمر کی باتوں سے خوف آیا تھا... وہ اسے دھمکیاں دے رہا تھا۔

میری کوئی غلطی نہیں ہے..میں نے اسے نہیں مروایا احمر...یہ ایک...حادثہ تھا..وہ اس کے سامنے کھڑی تھی.وہ اسے اپنے بے قصور ہونے کے دلائل دے رہی تھی.

اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

زندگی میں پہلی بار وہ بے قصور تھی اور وہ اس پر الزام لگا رہا تھا۔

اگر تم نے اسے نہیں مروایا تو تمہارے ڈیڈ نے اس کی موت کی خبر میڈیا پر کیوں نہیں چلنے دی؟کیوں میڈیا کو پیسہ کھلا کر ان کا منہ بند کر دیا گیا؟

رات ہی رات میں میرے دوست کی ڈیڈ باڈی کو ئٹہ روانہ کیوں کر دی؟

اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس حادثے میں تم کیوں بچ گئیں؟وہ لفظ چبا چبا کر بول رہا تھا.اس وقت احمر کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا.اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسے قتل کر دیتا۔

احمر کے سوالات پر علایا نے ملک صاحب کی طرف گردن موڑ کر دیکھا۔

اپنی بکواس بند کرو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔

ملک صاحب بری طرح دھاڑے تھے۔

میں اپنا منہ بند نہیں کروں گا..میرا باپ تم لوگوں کی دولت اور رتبے سے ڈرتا ہو گا..

میں تم سے نہیں ڈرتا ملک ریاض۔

ملک صاحب نے اپنی مٹھیوں کو سختی سے مینچا تھا. وہ احمر کو دھکے دے کر وہاں سے نکال دینا چاہتے تھے۔

اگر تم ایک منٹ میں یہاں سے نہیں گے تو میں تمہارا حشر بگاڑ دونگا.. ملک صاحب تیزی سے اس کی طرف آئے اور اس کا گریبان پکڑا۔

شرم کرو علایا... وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتہ بیٹا تھا... وہ اپنے ماں باپ کا آخری سہارا تھا. تمہارا حسد اسے کھا گیا.. میں تم۔۔۔۔

کمرے میں ایک زوردار تمانچے کی آواز گونجی تھی.. احمر بولتے بولتے رکا تھا. ملک صاحب کا دایاں ہاتھ اس کے بائیں گال پر پڑا تھا۔

علایا نے ملک صاحب کو حیران نظروں سے دیکھا۔

نکلو یہاں سے.... ملک صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے اسے باہر کا رستہ دکھایا تھا۔

احمر نے علایا کو دیکھا تو وہ بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

کمرے میں چند لمحے مکمل خاموشی رہی۔

احمر کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے. وہ دو قدم پیچھے ہٹا... اور پھر تیزی سے جانے کیلئے پلٹا.. چند قدم آگے بڑھ کر وہ پھر رکا.. اسے شاید کچھ یاد آیا تھا.. اس نے

.پلٹ کر علایا کو دیکھا جس کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے

ایک بات کا افسوس رہے گا علایا... کہ میرے ہیرے جیسے دوست نے تمہارے جیسی پتھر دل اور سنگ دل عورت سے محبت کی تھی... تھوو.. تھوکتا ہوں میں تم پر... اور اس کی اس محبت پر جو وہ تم سے کرتا تھا.. وہ جذبات میں اسے کیا کہہ کر گیا تھا اسے خود بھی معلوم نہ تھا۔

علایا کے چہرے پر سائے لہرائے تھے.. محبت؟؟ مجھ سے...؟ زاویار سکندر مجھ سے محبت کرتا تھا؟؟

تو اس نے اپنی جان کو خطرے میں اس لئے ڈالا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا تھا؟؟؟

وہ جیسے بے یقینی کے عالم میں آ گئی تھی. اسے اپنے کانوں پر بھی یقین نہیں ہو رہا تھا۔

ادھر ملک صاحب جو غصے سے لال ہو رہے تھے. احمر کی باتوں سے ان کا دماغ بھی ماؤف ہونے لگا تھا۔

* * * * * * * * *

وہ تیزی سے اپنے کمرے میں آیا. اس نے دھاڑ سے دروازہ بند کیا. اس کی آنکھیں رونے کے باعث سرخ پڑی تھیں. علایا ملک کو وہ نہیں چھوڑے گا یہ اس نے عہد کر

لیا تھا. اس نے جلدی سے الماری کھولی، ایک چھوٹا بیگ نکالا اور ہینگر میں لٹکی ہوئی شرٹیں اور پینٹیں نکال کر بیگ میں ڈالیں. اس کے بال مزید بکھرے ہوئے تھے، اسے اپنا کوئی ہوش نہیں تھا. اس کے لئے صدمہ کافی گہرا تھا. اسے لگتا تھا کہ کسی نے اس کا دل باہر نکال دیا ہے. وہ اس بات کو ماننے سے ہی قاصر تھا کہ یہ ایک حادثہ تھا. اسے یقین تھا کہ یہ ایک پری پلین مرڈر تھا جو علایا ملک نے کرایا تھا. احمر شیراز کو علایا ملک سے بدلہ لینا تھا اور اس کیلئے وہ کسی بھی حد تک جانے کو تیار تھا۔

یکدم ہی زور کی آواز سے دروازہ کھلا اور وہ غصے سے اندر داخل ہوئے۔

کیا بکواس کر کے آئے ہو تم ملک صاحب سے؟

تمہیں میں نے منع نہیں کیا تھا کہ وہاں مت جاؤ؟ شیراز صاحب غضب سے دھاڑے۔

رکشندہ بھی فوراً ان کے پیچھے آئی تھیں۔

میں نے وہ کہا جو آپ کو کہنا چاہیئے تھا. وہ تیوریوں میں بل ڈالتے ہوئے بولا۔

بکواس بند کرو احمر... وہ ایک حادثہ تھا. اس بات کو قبول کرو.. شیراز صاحب اسے ڈانٹتے ہوئے بولے۔

رکشندہ نے بیڈ پر پڑے اس کے بیگ کو دیکھا تو فوراً آگے بڑھیں۔

کہاں جارہے ہو تم؟ وہ بلکل اس کے سامنے آ گئیں تھیں۔

کوئٹہ جارہا ہوں...اس کے ماں باپ سے ملنے..وہ جھک کر بیگ کی زپ بند کرنے لگا۔

احمر تم ابھی نہیں جا سکتے..شیراز صاحب کا لہجہ تھوڑا نرم ہوا تھا.وہ احمر کی کیفیت کو سمجھ سکتے تھے۔

ملک صاحب نہیں چاہتے کہ ابھی کوئ بھی اس کے ماں باپ سے ملے.وہ نہیں چاہتے کہ کسی کو اس بات کا علم ہو کہ زاویار کی موت علایا کو بچاتے ہوئے ہوئ ہے. تمہیں پتہ ہے وہ سیاستدان ہیں..وہ اس طرح کی کوئ خبر میڈیا پر نہیں سننا چاہتے.وہ اسے سمجھانے والے انداز میں بول رہے تھے اور اسے اپنے ڈیڈ سے اس بات کی توقع نہیں تھی..اسے لگا تھا وہ اس کا ساتھ دینگیں.وہ زاویار کو انصاف دلوائیں گے مگر یہاں تو الٹی گنگا بہہ رہی تھی۔

ڈیڈ..مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی.وہ افسوس کرتے ہوئے بولا.ڈیڈ کا لہجہ اسے سمجھ نہیں آیا تھا۔

احمر..بے وقوفوں والی باتیں مت کرو..مجھے بھی زاویار سے اتنی ہی محبت ہے جتنی کہ تمہیں..میں۔۔۔

میری محبت کو اپنی محبت کے ساتھ نہ ملائیں. میری محبت بے لوث ہے ڈیڈ...اور آپ کی اس سے محبت میں آپ کا فائدہ شامل تھا..آپ نے اپنا مینیجر کھویا ہے ڈیڈ..میں نے اپنی زندگی کا سب سے قیمتی رشتہ کھویا ہے...میں خاموش نہیں بیٹھوں گا...اور میں جانتا ہوں کہ آپ کا بھی ملک ریاض نے پیسہ دے کر منہ بند کر دیا ہے...لوگوں کو خریدنے کا بڑا ہنر رکھتا ہے وہ۔۔

وہ شیراز صاحب کی بات کاٹ کر بولا تھا۔

شیراز صاحب نے آگے بڑھ کر ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر رسید کیا تھا. ان کے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں اس کے گال پر چھپی تھیں. انھیں احمر کا اس طرح بولنا بہت برا لگا تھا. رکشندہ نے شاک کے عالم میں اپنا دایاں ہاتھ اپنے ہونٹوں پر رکھا. شیراز نے کبھی اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا اور نہ رکشندہ نے کبھی اپنے بیٹے کو ڈانٹا تھا۔

احمر کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے تھے. سب اسے مار رہے تھے، اپنی بات سمجھا رہے تھے..کوئی اسے نہیں سمجھ رہا تھا...کیونکہ کوئی اس کی حالت سے جو نہیں گزر رہا تھا. اسے اپنے دل پر چھریاں چلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

احمر..میں...شیراز صاحب نے کچھ کہنا چاہا مگر کچھ کہہ نہیں پائے تھے. شاید ان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا. اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے وہ تیزی سے وہاں سے چلا گیا تھا..

اس نے اپنا بیگ نہیں اٹھایا تھا۔

احمر...رکشندہ اس کے پیچھے لپکی تھیں جبکہ شیراز صاحب اس کے کمرے میں ہی بیڈ پر بیٹھ گئے تھے۔۔

کیا واقعی میری زاویار سے محبت صرف بزنس کے فائدے کیلئے تھی؟

تم ایسا سوچتے ہو احمر؟ کیا واقعی تمہارا باپ اتنا لالچی تھا کہ اس نے پیسے لے کر اپنا منہ بند کر لیا؟ کیا واقعی؟؟ وہ عجیب لہجے میں خود سے ہم کلام تھے۔

* * * * * * * * * * *

NEW ERA MAGAZINE .com

وہ رات تو بے ہوشی کی نظر ہوئی تھی مگر یہ رات علایا کیلئے بڑی بھاری تھی. وہ شام میں گھر آگئی تھی. اس کا بخار ابھی تک نہیں اترا تھا. وہ اس وقت کالی شلوار قمیز پہنے بالوں کو جوڑے میں لپیٹے اپنی دراز قد کھڑکی کے دونوں پٹ کھولے سامنے کھڑی تھی. کھڑکی کے باہر لان تھا جو اس وقت مکمل خاموشی اور تاریکی میں ڈوبا تھا. وہ یونہی نیچے لان میں بنی کیاریوں کو دیکھتی رہی. سوچوں میں وہی رات والا منظر گھوم رہا تھا. چار سال سے اس سے نفرت میں گرفتار رہنے والی اور اس کو موت کی دھمکیاں دینے والی اب اس کی موت پر آنسو بہا رہی تھی۔

کون کہتا ہے کہ کسی کی موت سے انسان کو سکون مل جاتا ہے؟اس نے سوچا تھا۔

اسے یونی کا ہر وہ دن یاد آنے لگا جب جب وہ ایک دوسرے سے ہمکلام ہوئے تھے. وہ ہمیشہ اسے اپنے آس پاس ہی نظر آتا تھا اور وہ اس بات سے سخت چڑتی تھی۔

یہ یونی کا سیکنڈ ائیر تھا جب پورے ایک مہینے بعد پروفیسر دین محمد نے زاویار کو کلاس ریپریسینٹر منتخب کیا تھا. علایا اس فیصلے سے جل بھن گئی تھی.. کیونکہ فرسٹ ائیر میں وہ کلاس ریپریسینٹر رہی تھی۔

سر کیا کلاس ریپریسینٹر کوئی لڑکی نہیں ہو سکتی؟ضروری ہے کہ ہمیشہ لڑکوں کو لڑکیوں پر برتری دی جائے. وہ پروفیسر کے فیصلے سے متفق نہیں تھی. اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے صاف گویائی سے بولا۔

زاویار اس وقت پروفیسر دین محمد کے ساتھ کھڑا تھا. علایا کی اس بات پر پروفیسر بھی کچھ لمحے خاموش ہو گئے تھے۔

علایا..بیٹا بات برتری کی نہیں ہے، بات ذمہ داری کی ہے...مجھے لگتا ہے کہ جتنی اچھی طرح ایک لڑکا اس ذمہ داری کو نبھا سکتا ہے، کوئی لڑکی نہیں نبھا سکتی...پروفیسر اسے سمجھانے والے انداز میں بولے۔

زاویار نے علایا کے چہرے کو دیکھا جس پر جیلیسی کے آثار نمایاں تھے۔

میں اس ذمہ داری کو نبھا سکتی ہوں... آپکی معلومات کیلئے عرض ہے کہ میں فرسٹ ائیر میں سی آر تھی،اور میں نے اپنی ڈیوٹی باخوبی نبھائی تھی. وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر چیلنج کرتے ہوئے بولی۔

پوری کلاس کی گردنیں علایا کی طرف اٹھی تھیں۔

پروفیسر بھی کشمکش میں آ گئے تھے۔

سر اگر یہ اس ذمہ داری کو اپنے سر لینا چاہتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں. اس نے علایا کو دیکھتے ہوئے بغور کہا تھا۔

زاویار کے اس فیصلے سے پروفیسر کیلئے کافی آسانی ہو گئی تھی تو انھوں نے علایا کو ہی کلاس ریپریسینٹر منتخب کر لیا تھا اور اس کے چہرے پر زاویار کیلئے تپاد ینے والی مسکراہٹ امڈ آئی تھی۔

کلاس ختم ہوئی تو وہ باہر نکل کر آئی. بیگ اس نے کندھوں پر ڈال رکھا تھا. وہ سیدھی چلتی ہوئی ڈیپارٹمنٹ کے گیٹ تک آ گئی، باہر اس کی بلیک مرسیڈیز کھڑی تھی. وہ جونہی باہر نکلنے لگی تو اس کی نظر اس پر پڑ گئی. وہ ڈیپارٹمنٹ کی اندر والی دیوار سے ٹیک لگائے، بازو سینے پر لپیٹے نہایت سکون سے کھڑا تھا. اس کے چہرے پر کوئی غصہ، کوئی افسوس نہیں تھا. وہ شاید یہاں کھڑا ہو کر احمر کے آنے کا انتظار کر رہا تھا جو اسے یہاں

کھڑا کر کے کسی ضروری کام سے گیا تھا۔

علایا نے اسے دیکھا تو باہر جانے کے بجائے اس کے پاس چلی گئ۔

علایا ملک کی جگہ لینا اتنا آسان نہیں ہے زاویار سکندر...اور جو علایا کی جگہ لینا چاہتا ہے علایا ملک اس کے سر سے آسمان اور پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لیتی ہے.اس نے ایک زہریلی مسکراہٹ سے کہا۔

زاویار نے اسے دیکھا پھر جیسے اس کے چہرے پر دھیمی مسکراہٹ بکھر گئ۔

علایا تمہارا مسئلہ پتہ ہے کیا ہے؟ وہ ایک لمحے خاموش ہوا اور اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

تم اپنی خامیوں اور ناکامیوں سے سیکھنے کے بجائے دوسروں کی کامیابیوں سے جلتی" ہو...اور میرے نزدیک ایسی کامیابی کا کوئ فائدہ نہیں جو دوسروں سے چھین کر حاصل کی جائے..نہ اس میں آپ کو کوئ خوشی ملے گی اور نہ اس میں کوئ آپ کا کمال..تم حاسد ہو اور حاسد لوگ دوسروں کو تباہ کرتے کرتے ایک دن اپنی لگائ ہوئ آگ میں خود ہی جل کر برباد ہو جاتے ہیں." وہ پر سکون لہجے میں نہایت آرام سے بولا تھا۔

نہ میں کبھی ناکام ہوئ ہوں اور نا میرے پاس کسی شے کی کمی رہی ہے..وہ سپاٹ لہجے میں بولی.زاویار کی بات پر اس کے وجود میں غصے کی لہر دوڑ گئ تھی۔

غلط...یہ تمہاری سب سے بڑی بھول ہے کہ تمہارے پاس کسی شے کی کمی نہیں..وہ

ابھی بھی پر سکون تھا. اس نے اپنے بازو سینے پر سے ہٹائے اور تھوڑا اور اس کے نزدیک آیا۔

تمہیں اللہ نے سب سے قیمتی شے سے محروم رکھا ہے... وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا. علایا کی تیوریوں میں بل پڑے۔

تمہیں اللہ نے اپنی رہبری سے محروم رکھا ہے... تمہارے لئے اُس نے کوئی رہبر نہیں بھیجا جو تمہیں سیدھا رستہ دکھا سکے... وہ افسوس کرتے ہوئے بولا۔

علایا جو تھوڑی دیر پہلے اسے جلانے آئی تھی اب خود جل بھن گئی تھی۔۔

اس سے پہلے کے وہ اسے کوئی جواب دیتی زاویار نے احمر کو آتے دیکھ لیا تھا۔

ایکسکیوزمی.... وہ کہہ کر خود ہی وہاں سے چلا گیا تھا۔

اور آج ساڑھے تین سال بعد اسے زاویار کی یہ بات یاد آئی تھی۔

اس نے ایک لمبی آہ اندر کھینچی.. اسے ابھی تک یقین نہیں آیا تھا کہ جس شخص کی موت کی دعائیں وہ مانگتی رہی تھی اب اس کے گزر جانے کے بعد اسے کس بات کا دکھ تھا؟

شاید اسے پچھتاوا تھا مگر وقت گزر جانے کے بعد کس بات کا پچھتاوا تھا؟

احمر کی باتیں یاد آئیں تو اسے دکھ ہوا. احمر نے اس حادثے کا سارا الزام اس پر لگا دیا تھا.

اب وہ کیا کرے؟ علایا بھی کہیں نہ کہیں اپنے آپ کو اس حادثے کا ذمہ دار سمجھنے لگی

تھی. پھر اس کے ماں باپ کا خیال آیا تو نا جانے کیوں اس کا دل بیٹھنے لگا تھا۔۔

بوڑھے ماں باپ کا جوان بیٹے کی موت کا دکھ جھیلنا کسی قیامت سے کم نہیں ہوتا،اس نے سوچا تھا. پھر اسی کے ساتھ اس نے ایک اور فیصلہ بھی کر لیا تھا۔

* * * * * * * * *

ملک صاحب اس وقت کار کی پیچھے والی سیٹ پر بیٹھے تھے. ان کی آج کوئی امپورٹینٹ میٹینگ تھی جس میں جانا انتہائی ضروری تھا. علایا نے اپنے آپ کو گھر تک ہی محدود کر لیا تھا اور وہ اب آفس بھی نہیں جا رہی تھی. جس کی وجہ سے ملک صاحب کچھ دنوں سے آفس جانے لگے تھے۔۔

گاڑی تیزی سے اپنے رستے پر رواں دواں تھی. وہ پینٹ کوٹ پہنے ڈیسینٹ سے لگ رہے تھے. چہرے پر وہی سوچ کے نشانات واضح تھے. وہ دروازے سے ٹیک لگائے اپنی منزل تک پہنچنے کے منتظر تھے کہ اچانک ان کے موبائل نے شور مچایا. انھوں نے سیٹ پر پڑے اپنے موبائل کو ہاتھ میں اٹھایا تو یکدم ہی وہ یہ نام پڑھ کر سن ہو گئے۔

Z.S calling

انھوں نے نام زیر لب پڑھ کر اپنے سر کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے دبایا. ایک لمبی

سانس انھوں نے اندر کی طرف کھینچی پھر ڈرائیور سے گاڑی ایک کونے میں رکوائی. پھر خود گاڑی سے باہر آ گئے. موبائل کی گھنٹی اب بند ہو چکی تھی۔

انھوں نے بغیر کچھ سوچے تیزی سے اس کا نمبر ڈائل کیا۔

فون فوراً ہی پک کیا گیا تھا اور لمحوں میں اس کی آواز ان کے کانوں میں گونجی تھی. تم کیا چاہتے ہو شیخ؟ کیوں تم مجھے سکون سے نہیں رہنے دیتے.. وہ یکدم ہی غصے سے بولے۔

تم اچھی طرح جانتے ہو ملک کہ میں تم سے کیا چاہتا ہوں.. وہ ہنستے ہوئے بولا تھا۔

تمہارے جیسا گھٹیا انسان میں نے زندگی میں نہیں دیکھا.. ملک صاحب کو اس پر شدید غصہ آنے لگا۔

NEW ERA MAGAZINE .com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

میرا بھی تمہارے بارے میں یہی خیال ہے ملک... اور اگر میں تمہارا راز کھول دوں تو..... علایا کا بھی تمہارے بارے میں یہی خیال ہو گا.. اس کے لہجے میں شیطانیت جھلک رہی تھی۔

تم ایسا کچھ نہیں کرو گے... وہ لفظ چبا کر بولے۔

میں کچھ بھی کر سکتا ہوں... اگر تم نے آج کے آج میرے اکاؤنٹ میں ۱۰ لاکھ کی رقم نہیں بھیجی تو میری اگلی کال علایا کے پاس جائے گی. اس نے ملک صاحب کو وارن کیا تھا۔

شیخ... تئیس سالوں سے تم مجھے لوٹتے آرہے ہو..یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟ان کی تیوریوں میں بل تھے مگر انھوں نے اپنے غصے کو خاصا کنڑول کیا ہوا تھا۔

جب تک ہم میں سے کوئی ایک زندہ ہے تب تک۔۔۔

میں...ملک صاحب کچھ کہتے تو اس نے لائن کٹ کر دی ملک صاحب نے ملامتی نظروں سے موبائل کو دیکھا۔

انھوں نے اپنی مٹھیوں کو سختی سے مینچا،ان کی رنگیں تن گئیں اور ماتھے پر غصے کے آثار نمایہ ہوئے۔

اس سے اچھا تو یہ تھا شیخ کہ میں تجھے اپنے ہاتھوں سے مار دیتا...وہ بڑبڑاتے ہوئے بولے پھر تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے.دل ودماغ میں غصے کی لہر دوڑ چکی تھی۔

بینک چلو..انھوں نے ڈرائیور کو حکم دیا۔

ڈرائیور نے اثبات میں گردن ہلائی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

زرینہ بی.....؟؟؟؟

زرینہ بی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟؟

وہ بری طرح چیخی تو اس کی آواز پر وہ فوراً ہی کمرے میں آ گئی تھیں۔

وہ اس وقت اپنے آرٹ روم میں موجود تھی جہاں بہت ساری مختلف قسم کی پینٹنگز رکھی تھیں. یہ آرٹ روم پہلی منزل پر تھا اور اس روم کی سیڑھیاں لان میں اترتی تھیں۔

علایا کی بنائی ہوئی پینٹنگز خوبصورت فریمز میں ہو کر آرٹ روم کی دیواروں پر لگی تھیں۔

کمرے کے بلکل سامنے ایک فریم لگا تھا جس میں اس نے ملک صاحب کے ساتھ اپنا اسکیچ بنایا تھا. یہ اس کی سب سے پسندیدہ پینٹنگ تھی جس میں اس نے اپنی مرضی سے خوبصورت رنگ بھر کر اسے دیکھنے کے قابل بنا دیا تھا۔

کمرے کے وسط میں کینوس رکھا تھا جس پر کپڑا اڈلا تھا۔

وہ اس کمرے میں پورے سات سال بعد آئی تھی۔

جی بی بی... زرینہ بی اپنے گیلے ہاتھوں کو اپنے ڈوپٹے سے پوچھتے ہوئے بولیں. ان کا سانس پھول رہا تھا. وہ اس وقت کچن میں آٹا گوندھ رہی تھیں جب ہی علایا نے آواز

لگائی تھی اور وہ ہاتھ دھو کر تیزی سے اوپر بھاگتی ہوئی آئی تھیں۔

میرا کچھ سامان یہاں سے غائب ہے..وہ کمرے کے مخصوص کنارے پر اشارہ کرتے ہوئے بولی جہاں اس کا سامان رکھا تھا۔

وہ تو میں نے اسٹور میں ڈلوا دیا بی بی..وہ دبی آواز میں بولیں۔

ہاں...کیا کہا؟؟ کس کے حکم سے تم نے یہ حرکت کی؟ وہ بری طرح دھاڑی تھی۔

وہ..جی..وہ...مس نے سوچا اب آپ بڑی ہو گئی ہیں...اب آپ کو ان سب چیزوں کی کیا ضرورت۔۔۔۔۔۔

دفع ہو جاؤ یہاں سے..اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتیں علایا نے انھیں انگلی کے اشارے سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

اس سے پہلے کہ وہ باہر جاتیں علایا تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔۔

ہونہہ..آئی بڑی...زرینہ بی نے انتہائی برا منہ بنایا تھا. انھوں نے اپنے ڈوپٹے کو ٹھیک سے اوڑھا اور بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

علایا تیز تیز ڈگ بھرتی ہوئی اسٹور کے دروازے پر پہنچی. ایک نظر اسٹور کے بھاری دروازے کو دیکھا پھر آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی. اسٹور کی حالت اندر سے بہت خراب تھی. دیواروں پر بڑے بڑے جالے لگے تھے. ملک صاحب اور علایا

اسٹور میں نہیں آتے تھے تو گھر کے ملازمین نے بھی اس جگہ کی صفائی کا خیال نہ رکھنا ہی مناسب سمجھا. اسٹور میں کافی کاٹھ کباڑ پڑا تھا. اس نے غصے سے ایک گہری سانس اندر کھینچی اور ادھر ادھر نگاہ دوڑائی. اسے اپنا وہ صندوق نظر آ گیا جس میں اس نے اپنے بچپن کی پسندیدہ چیزیں سنبھال کر رکھی تھیں. وہ چند قدم آگے بڑھی تو صندوق کے پاس پہنچی. اتنے سالوں میں اس پر گرد جم چکی تھی. اس نے جیسے ہی صندوق کھولا تو گرد دھوئیں کی طرح اسے اڑتی ہوئی محسوس ہوئی. اسے یکدم ہی کھانسی آئی تھی. اس نے منہ پر دائیں ہاتھ کی پشت رکھی اور کھانسنا شروع کیا. اس نے اپنے کپڑے دیکھے جو مٹی کے باعث گندے ہو گئے تھے. وہ کپڑوں کی پرواہ کئے بغیر صندوق کے کناروں پر ہاتھ رکھ کر گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئی. اس نے صندوق میں جھانکا، ان تمام چیزوں پر نظر پڑتے ہی اس کا دل عجیب سحر میں مبتلا ہو گیا تھا. اس میں اس کے بچپن کے تمام کھلونے موجود تھے. جس کھلونے پر اس کی نظر سب سے پہلے پڑی تھی وہ کبھی اس کی ہمراز ہوا کرتی تھی. اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے باہر نکالا۔

پنکی.... بچپن کے کھلونے دیکھ کر اسے لگا کہ وہ پھر ایک چھوٹی بچی بن گئی ہے. پنکی اس کی سب سے پیاری اور پسندیدہ گڑیا تھی. اس کو دیکھتے ہی وہ ہر شے سے بے نیاز ہو کر ماضی کی گہرائیوں میں جانے لگی۔

اس کے پاس دنیا کی ہر آسائش تھی مگر اسے محسوس ہوتا تھا کہ کہیں نہ کہیں اس کا دل خالی تھا. اس کے پاس سب کچھ ہوتا مگر پھر بھی وہ دوسرے کے پاس عام سی چیز دیکھ کر بھی جیلس ہو جاتی۔

ملک صاحب تو سارا سارا دن گھر پر نہیں ہوتے تھے، بس کھانے کے وقت آتے اور پھر فوراً ہی چلے جاتے. زرینہ بی بھی کام کر کے اپنے کمرے میں کھسک لیتیں اور علایا اپنے کمرے میں گھنٹوں اکیلی پڑی رہتی. کوئی دوست، کوئی ہمدم اس کے پاس نہ ہوتا. وہ اکیلی کمرے کی دیواروں سے باتیں کرتی. شام میں اوپر چھت پر چلی جاتی اور ٹیرس میں بیٹھ جاتی. بنگلے کے سامنے ایک خوبصورت پارک بنا تھا جہاں ڈھیروں بچے شام میں کرکٹ کھیلنے آتے تھے۔

وہ گھنٹوں وہاں بیٹھی انھیں کھیلتا دیکھتی رہتی. وہ بارہ سال کی تو تھی جب اس کا دل بھی ان بچوں کے ساتھ کھیلنے کو کرتا تھا. وہ بھی عام بچوں کی طرح زندگی گزارنا چاہتی تھی، مگر ڈیڈ اسے اکیلے کہیں نہیں جانے دیتے تھے نہ وہ اسے دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت دیتے۔

روز بچوں کو ہنستا کھیلتا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے. بچپن میں اس نے اپنا ہمراز اپنی گڑیا کو بنا لیا تھا جس سے وہ ہر بات کرتی. یہ گڑیا اس کے لئے کسی نے جاپان

سے بھیجی تھی مگر ڈیڈ نے آج تک اسے اس انسان کا نام نہیں بتایا تھا. اس کے علاوہ اکثر اس کے پاس جاپان سے گفٹس آتے تھے مگر جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئ، وہاں سے گفٹس آنا بھی بند ہو گئے یا پھر شاید وہ گفٹس اب بھی آتے ہوں مگر ملک صاحب نے گارڈز کو وہ گفٹس ریسیو کرنے سے منع کر دیا ہو۔

یہ گڑیا بھی اس کے پاس ایسے پہنچی کے ملک صاحب کچھ دنوں کے لئے شہر سے باہر گئے تھے تو ان دنوں یہ پارسل آیا تھا اور یہ پہلا پارسل تھا جو اس کی نویں برتھڈے پر جاپان سے بھیجا گیا تھا. گارڈ نے اسے لا کر پارسل دیا تھا اور جب اس نے کھولا تو وہ سمجھی کہ یہ ڈیڈ نے اس کیلئے منگوایا ہو گا. اسے یہ تحفہ بہترین لگا تھا. وہ بہت خوش ہوئی تھی۔

جب ڈیڈ آئے تھے تو اس نے انھیں گلے لگ کر تھینکس کہا تھا۔

یہ تھینکس کس لئے؟ وہ حیران ہوئے تھے۔

مجھے اتنی اچھی ڈول دینے کیلئے... وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

ڈول... کونسی ڈول علایا؟ وہ حیران آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہے؟

وہ اس وقت لاؤنج میں صوفے پر بیٹھے تھے۔

ڈیڈ... آپ مجھے سرپرائیز دے کر بھول گئے؟ وہ خفا ہوئی تھی۔

پھر تیزی سے اوپر گئی اور کمرے سے اپنی گڑیا لے کر آئی۔

ملک صاحب نے اس گڑیا کو دیکھا تو شل سے رہ گئے۔انھوں نے گڑیا کو ہاتھ میں لیا اور فوراً گارڈ کو بلوایا۔

گارڈ سے معلومات لی تو معلوم ہوا کہ کسی نامعلوم شخص نے جاپان سے بھیجی ہے۔ملک صاحب کے چہرے پر سائے لہرائے تھے۔ان کے دماغ نے تیزی سے انھیں اس شخص کا نام بتایا تھا۔انھوں نے اس گڑیا کو غصے میں دور پھینکا تھا۔وہ اس گڑیا کا سایہ بھی علایا پر نہیں پڑنے دینا چاہتے تھے مگر وہ نا جانے کتنے گھنٹوں کمرے میں بند ہو گئی تھی اور خوب روئی۔۔اور پھر ملک صاحب نے اسے خوب سمجھایا کہ وہ اس سے کہیں خوبصورت اور اچھی گڑیا اس کو لا کر دینگیں مگر اس نے بھی ضد لگالی تھی کہ اسے یہی گڑیا چاہیئے تھی۔

ملک صاحب نے دل پر جبر کرتے ہوئے اسے وہ گڑیا دیدی۔یہاں سے اس کی ضدوں کا سلسلہ شروع ہوا۔اسے کوئی چیز پسند آجاتی تو بس وہ اسے فوراً چاہیئے ہوتی تھی۔ڈیڈ اسے ہمیشہ یہ کہتے کہ میں اس سے بھی اچھا دلاؤں گا،انھوں نے ہی تو اس کے دماغ کو کمتر اور اعلیٰ کے جھگڑے میں ڈالا تھا۔جیسے جیسے وہ بڑی ہونے لگی پھر اسے اپنے علاوہ سب کمتر لگنے لگے تھے۔اس کے نزدیک جو سب سے اعلی ذات تھی وہ اس کی اپنی ذات تھی۔

خیر یہ جاپان والی گڑیا اس کی پسندیدہ تھی. یہ کافی بڑی تھی بلکل ایک چھوٹے بچے کے جیسی پیاری اور نیلی آنکھوں والی. اس گڑیا کے بال سنہری رنگ کے تھے. اس کے سینے پر ایک بٹن تھا جب علایا وہ بٹن دباتی تو وہ جاپانی میں اسے کچھ کہتی تھی. کبھی وہ اسے نظمیں سناتی اور کبھی وہ اس سے پہیلیاں پوچھتی. چونکہ علایا کو جاپانی نہیں آتی تھی تو اس نے کبھی ان الفاظ پر غور نہیں کیا تھا اور رہی بات پہیلیوں کی تو وہ بھی اسے سمجھ نہیں آتی تھیں۔

وہ اسے ہر وقت اپنے ساتھ ہی رکھتی تھی۔

دیکھو پنکی... سب بچے کھیل رہے ہیں. اس نے پنکی کو ٹیرس سے باہر دکھاتے ہوئے کہا۔

مگر پنکی اس سے کوئی بات کرنے کے بجائے اسے کوئی نظم سنا دیتی۔

اسے پنکی پر بئ کبھی غصہ آتا، ہر وقت کی نظموں سے وہ بور ہونے لگی تھی. اسے کسی دوست کی ضرورت تھی۔

علایا ملک جس کی زندگی میں لوگوں کو کوئی کمی نہیں لگتی تھی، وہ بچپن سے ہی بہت سی چیزوں سے محروم رہی تھی مگر اس نے کبھی کسی کے سامنے ان چیزوں کا رونا نہیں رویا. اس نے کبھی کسی کو کچھ نہیں بتایا. اس نے ان سب باتوں کا گلہ اپنے ڈیڈ تک سے

نہیں کیا تھا. جس شخص کے پاس علایا کو دینے کیلئے وقت نہیں تھا اس سے وہ اور کیا مانگ سکتی تھی؟

What belongs to you, but other people use it more than you?

کمرے میں اچانک اس آواز سے وہ یکدم چونکی. ماضی کا بلبلہ پھٹا تو اس نے اس وقت بھی کمرے میں خود کو تنہا ہی پایا. ساتھ تھی تو پنکی. یہ ایک پہیلی تھی جو انگلش میں پنکی نے اس سے پوچھی تھی. بچپن میں تو کبھی اس نے ان پہیلیوں پر غور و فکر نہیں کیا تھا مگر اب اس پہیلی کو سننے کے بعد اسے پھر سے پنکی میں انٹرسٹ ہونے لگا تھا. وہ فوراً وہاں سے کھڑی ہوئی. اس نے اپنے ہاتھ دیکھے جو گرد میں اٹے تھے. اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو جھاڑا اور پنکی کو لے کر اسٹور روم سے باہر آ گئی۔

دل میں پھر وہی سوالات آنے شروع ہو گئے کہ یہ شخص کون تھا جو اسے تحائف بھیجتا تھا؟

ڈیڈ اس کے تحائف دیکھ کر غصے میں کیوں آتے تھے؟

کمرے میں آ کر وہ پنکی کی پہیلی بھوجنے لگی۔۔

ایسی کیا چیز ہے جو آپ کی ہے مگر آپ سے زیادہ دوسرے اسے استعمال کرتے "ہیں؟"

وہ گہری سوچ میں ڈوبی تھی.. کمرے میں ٹہلتی وہ یہاں سے وہاں گھوم رہی تھی۔ پھر قدآور کھڑکیوں کے سامنے آ گئی۔ پردے ہٹائے اور لان میں دیکھنے لگی.. وہ کافی دیر سے یونہی لان میں دیکھ رہی تھی جب ہی اس کی آنکھوں میں اچھونبا ہوا۔

اس نے اپنی نگاہیں اس پر جما دیں.. اس کے ہاتھوں میں سرخ گلابوں کا بکے تھا اور ساتھ میں ایک خوبصورت اور بڑا سا باکس تھا. یہ تحائف ابھی ابھی کہیں سے آئے تھے اور گارڈ وہ باکس اندر لانے کے بجائے کسی کا انتظار کر رہا تھا. تھوڑی ہی دیر میں زرینہ بی آتی دکھائی دیں.. انھوں نے اس کے ہاتھ سے وہ سامان لیا اور سرونٹ کوارٹر کی طرف بڑھ گئیں. وہ شل سی کھڑی کھڑکی سے باہر یونہی دیکھتی رہی. اسے اچانک یاد آیا تھا کہ آج ۲۵ اگست تھی یعنی اس کی برتھڈے اور ڈیڈ نے اسے ہمیشہ کی طرح وش نہیں کیا۔

زاویار کی ٹینشن میں وہ اپنی برتھڈے بھول گئی تھی. مگر یہ کون تھا جو اسے اب تک گفٹس بھیجتا تھا؟

تو وہ گفٹس اب بھی آتے تھے؟

وہ کمرے سے باہر آئی اور سیدھی لان میں چلی گئی پھر تھوڑی دیر یونہی ٹہلتی رہی. زرینہ بی اسے دور سے آتی دکھائی دیں، وہ سرونٹ کوارٹر سے آرہی تھیں. علایا کو دیکھ کر زبردستی کی مسکراہٹ دی پھر سیدھی اندر چلی گئیں. اس نے انھیں اندر جاتے دیکھا پھر تیزی سے اس نے اپنے قدموں کا رخ سرونٹ کوارٹر کی طرف موڑ لیا. دل میں عجیب سی بے چینی تھی. اسے آج تک یہ راز معلوم نہ ہو سکا تھا. وہ اب ڈیڈ سے نہیں پوچھے گی. جو معلوم کرنا ہے اب وہ خود کرے گی. اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا. نہ وہ گفٹس دینے والے کو جانتی تھی اور لاکھ بار پوچھنے پر بھی ڈیڈ نے اسے کبھی نہیں بتایا تھا۔

سرونٹ کوارٹر میں پہنچ کر اس نے اطمینان سے یہاں وہاں دیکھا. تمام کمرے بلکل خالی تھے کیونکہ سب اسوقت ڈیوٹی پر تھے۔

اس نے اپنے قدم زرینہ بی کے کمرے میں بڑھائے۔

کمرے میں پہنچ کر اس کا دل دھک سا رہ گیا. ان کے کمرے میں سوائے پلنگ اور الماری کے کچھ بھی نہ تھا. اس نے الماری کھولی تو ان کے کپڑے بارش کی طرح زمین پر برس پڑے. اس نے غصے سے ان کپڑوں کو دیکھا پھر برا سا منہ بنا کر انھیں واپس ان کے خانے میں ٹھونسے. غصے سے اس کا دماغ کھول رہا تھا. وہ جلدی سے الماری بند کے

کر پلٹی اور دروازے تک آئی پھر جیسے کسی خیال کے تحت قدم زنجیر ہوئے۔

پلنگ کے نیچے اسے کچھ محسوس ہوا تھا. وہ تیزی سے پلنگ کے پاس آئی پھر جھک کر نیچے دیکھا تو لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ آ گئی. دونوں چیزیں انھوں نے پلنگ کے نیچے چھپا رکھی تھیں. علایا نے ہاتھ بڑھا کر دونوں چھزیں نکالیں اور سر وینٹ کوارٹر سے باہر آئی. گارڈ اس وقت باہر تھا. لان میں خاموشی تھی. اس نے لاؤنج سے گزر کر جانے کے بجائے آرٹ روم کے کمرے میں جانا مناسب سمجھا.. وہ جلدی سے آرٹ روم کی سیڑھیاں چڑھنے لگی جو لان میں اترتی تھیں۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے روم کو لاک کیا پھر باکس کو زمین پر رکھا اور خود بھی نیچے زمین پر بیٹھ گئی. پھر تازے گلابوں کی مہک سونگی. یہ بلکل ابھی ابھی خریدے گئے ہونگے. اس نے سوچا. مگر یہ تو جاپان سے آئے تھے. باکس پر لگا کارڈ اس نے کھولا تو اس پر بھیجنے والے نے بڑا بڑا ایس اے لکھا تھا۔

S. A

From japan

اس نے زیر لب دھرایا.. یہ کون تھا؟

اس نے وہ باکس کھولا تو اندر ایک اور باکس تھا مگر یہ باکس کارڈ شیٹ سے بنایا گیا تھا. اس

نے باکس کا کیپ اتارا تو کارڈ یکدم ہی کھل گیا. یہ انتہائی خوبصورت کارڈ تھا جس کے چاروں اطراف ربن سے ڈھیر ساری چاکلیٹس لگی تھیں. یہ جاپان کی مشہور چاکلیٹس تھیں، اس نے ربن سے چاکلیٹس نکالیں تو چاروں اطراف میں ایک ایک کارڈ اور لگا تھا اس نے اس کارڈ کو کھولا تو آنکھوں میں حیرانی در آئی. یہ کسی آدمی کی تصویر تھی مگر وہ اسے نہیں جانتی تھی. چاروں اطراف میں اسی کی شکل والے آدمی کے الگ الگ پوز تھے. وہ اپنی متورم آنکھوں سے اسے دیکھے گئی. اسے یہ شخص دیکھا دیکھا معلوم ہونے لگا. اس نے ایک تصویر کارڈ سے نکالی اور ہاتھ میں پکڑ کر دیکھنے لگی جب ہی اس کی نظر اس چٹ پر پڑی تھی. اس نے تصویر ایک طرف رکھی پھر دائیں ہاتھ سے چٹ اٹھا کر کھولی۔

What do you say to a princess on her birthday?

اس کے ساتھ ہی ایک اسمائیلی فیس بھی بنا تھا۔ ...

I would say Happy Biryhday!

وہ تیزی سے بولی پھر دوبارہ چٹ پڑھی۔

اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی. وہ شہزادی تو تھی۔

یہ ایک پہیلی تھی جو اس نے بوجھ لی تھی۔

کون تھا وہ جس نے اس کیلئے اتنی محنت کی تھی۔

اس نے مزید تصاویر نکالیں تو مزید چٹس ہاتھ میں آ گئیں. وہ اکسائٹڈ سی ہو کر ان چٹس کو کھولنے لگی۔

自業自得

یہ کیا تھا اسے کچھ سمجھ نہ آیا وہ یونہی اسے دیکھتی گئ. شاید جاپانی میں کچھ لکھا تھا۔

اس نے تیسری چٹ کھولی۔

Wake from death and return to life.

NEW ERA MAGAZINE .com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

موت سے اٹھو اور زندگی کی طرف لوٹ جاؤ۔

وہ الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ اسے سمجھنے لگی تھی. یہ کوئ جاپانی محاورہ تھا۔

اس نے بڑی دلچسپی کے ساتھ آخری چٹ کھولی. وہ اس میں بھی کوئ پہیلی ہی سمجھ رہی تھی۔

تم سوچتی ہو کہ میں کون ہوں؟

تو میں تمہیں بتاؤں کہ میں ایک راز ہوں جسے جاننے کیلئے تمہیں اس سرنگ کو ڈھونڈنا

ہو گا جسے بند کرنا ملک ریاض بھول گیا ہے. میں تمہارا انتظار کروں گا۔

علایا کا سارا وجود یکدم ہی ٹھنڈا پڑنے لگا. کیسا راز، کونسی سرنگ؟ وہ اپنے نرم ہاتھوں میں چٹ تھامے بیٹھی عجیب سوالات کا شکار ہو گئی تھی۔

آخر ڈیڈ نے اس سے کیا چھپایا تھا؟

اور بھیجنے والے نے اسے جگہ بھی نہیں بتائی تھی کہ وہ کہاں اس کا انتظار کر رہا ہے۔

اسے سچ جاننا تھا مگر کیسے؟ اس کا فیصلہ اس نے ابھی نہیں کیا تھا۔

NEW ERA MAGAZINE .com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

* * * * * * * * * *

ملک صاحب اس وقت کار کی پیچھے والی سیٹ پر بیٹھے تھے. ان کی آج کوئی امپورٹنٹ میٹینگ تھی جس میں جانا انتہائی ضروری تھا. علایا نے اپنے آپ کو گھر تک ہی محدود کر لیا تھا اور وہ اب آفس بھی نہیں جا رہی تھی. جس کی وجہ سے ملک صاحب کچھ دنوں سے آفس جانے لگے تھے۔۔

گاڑی تیزی سے اپنے رستے پر رواں دواں تھی. وہ پینٹ کوٹ پہنے ڈیسینٹ سے لگ

رہے تھے. چہرے پر وہی سوچ کے نشانات واضح تھے. وہ دروازے سے ٹیک لگائے اپنی منزل تک پہنچنے کے منتظر تھے کہ اچانک ان کے موبائل نے شور مچایا. انھوں نے سیٹ پر پڑے اپنے موبائل کو ہاتھ میں اٹھایا تو یکدم ہی وہ یہ نام پڑھ کر سن ہو گئے۔

Z.S calling

انھوں نے نام زیر لب پڑھ کر اپنے سر کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے دبایا. ایک لمبی سانس انھوں نے اندر کی طرف کھینچی پھر ڈرائیور سے گاڑی ایک کونے میں رکوائی. پھر خود گاڑی سے باہر آ گئے. موبائل کی گھنٹی اب بند ہو چکی تھی۔

انھوں نے بغیر کچھ سوچے تیزی سے اس کا نمبر ڈائل کیا۔

فون فوراً ہی پک کیا گیا تھا اور لمحوں میں اس کی آواز ان کے کانوں میں گونجی تھی. تم کیا چاہتے ہو شیخ؟ کیوں تم مجھے سکون سے نہیں رہنے دیتے.. وہ یکدم ہی غصے سے بولے۔

تم اچھی طرح جانتے ہو ملک کہ میں تم سے کیا چاہتا ہوں.. وہ ہنستے ہوئے بولا تھا۔

تمہارے جیسا گھٹیا انسان میں نے زندگی میں نہیں دیکھا.. ملک صاحب کو اس پر شدید غصہ آنے لگا۔

میرا بھی تمہارے بارے میں یہی خیال ہے ملک... اور اگر میں تمہارا راز کھول دوں تو..... علایا کا بھی تمہارے بارے میں یہی خیال ہو گا.. اس کے لہجے میں شیطانیت

جھلک رہی تھی۔

تم ایسا کچھ نہیں کرو گے...وہ لفظ چبا کر بولے۔

میں کچھ بھی کر سکتا ہوں...اگر تم نے آج کے آج میرے اکاؤنٹ میں ۱۰ لاکھ کی رقم نہیں بھیجی تو میری اگلی کال علایا کے پاس جائے گی.اس نے ملک صاحب کو وارن کیا تھا۔

شیخ...تئیس سالوں سے تم مجھے لوٹتے آرہے ہو..یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟ان کی تیوریوں میں بل تھے مگر انھوں نے اپنے غصے کو خاصا کنٹرول کیا ہوا تھا۔

جب تک ہم میں سے کوئی ایک زندہ ہے تب تک۔۔۔

میں...ملک صاحب کچھ کہتے تو اس نے لائن کٹ کر دی ملک صاحب نے ملامتی نظروں سے موبائل کو دیکھا۔

انھوں نے اپنی مٹھیوں کو سختی سے مینچا،ان کی رنگیں تن گئیں اور ماتھے پر غصے کے آثار نمایہ ہوئے۔

اس سے اچھا تو یہ تھا شیخ کہ میں تجھے اسی وقت اپنے ہاتھوں سے مار دیتا...وہ بڑبڑاتے ہوئے بولے پھر تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے.دل و دماغ میں غصے کی لہر دوڑ چکی تھی۔

بینک چلو..انھوں نے ڈرائیور کو حکم دیا۔

ڈرائیور نے اثبات میں گردن ہلائی۔

NEW ERA MAGAZINE .com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

* * * * * * * * * * * *

ملک صاحب شام میں گھر آ گئے تھے.زرینہ بی نے کھانے کی میز تیار کی تو وہ فریش ہو کر ڈائینگ ہال میں آ گئے۔۔

علایا کہاں ہے؟انھوں نے زرینہ بی سے پوچھا۔

وہ کچھ دیر کیلئے باہر گئی ہیں...زرینہ بی نے انھیں آگاہ کیااور خود ڈائینگ ہال سے باہر آ گئیں۔۔۔

پتہ نہیں اب کیا چاہتی ہے یہ..؟پہلے زاویار کو مروانا چاہتی تھی.اسے سکون چاہیئے تھا.

اب مر گیا تو بھی سکون نہیں ہے..انھوں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

انھوں نے ایک نظر کھانے کو دیکھا پھر یکدم ہی جیسے ان کی ساری بھوک اڑ گئی تھی۔

اگر شیخ نے علایا کو سچ بتا دیا تو کیا ہو گا؟ یہ سوچ آتے ہی ان کا دل ڈوبنے لگا. انھوں نے گلے میں پہنی ٹائی اتاری. پھر اپنے کمرے کی طرف چل دیئے. انھیں اوپر سے دیکھنے والے لوگ ان کے اندر سے ناواقف تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

کسی کے بچھڑ جانے کے بعد صبر کیسے ملتا ہے یہ راز آج تک معلوم نہ ہو سکا. جن کے بغیر لگتا ہے جینا محال ہو جائے گا، وہ زندگی سے نکل جائیں تو بھی زندگی نہیں رکتی. رونا دھونا بس کچھ دن کا ہوتا ہے، پھر انسان وہی اپنی زندگی میں مشغول ہو جاتا ہے، اپنی ذمہ داریوں میں اتنا الجھ جاتا ہے کہ اسے بچھڑنے والا شخص یاد بھی نہیں رہتا. احمر بھی کچھ دن رویا کچھ دن پیٹا پھر ڈیڈ کے خوب سمجھانے پر اپنی زندگی میں واپس آیا۔

علایا سے بدلہ اس نے لینا ہے یہ تو طے تھا مگر کب وہ اس موقع کی تلاش میں تھا۔اس سے پہلے اس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا تھا۔

ڈیڈ کے سامنے اس نے یونہی کہہ کر انھیں تسلی کرا دی تھی کہ وہ سمجھ گیا ہے کہ یہ ایک

حادثہ تھا۔

دن تیزی سے گزرنے لگے اور ہر نیا دن احمر کیلئے ایک نئی امید لے کر آتا تھا. وہ کچھ ہی دنوں میں اپنی نارمل زندگی میں آگیا تھا. زاویار کے جانے کے بعد اس نے صحیح معنوں میں جدوجہد شروع کر دی تھی. اب وہ اپنے ڈیڈ کے آفس جانے لگا تھا. زاویار کی جگہ اس نے سنبھال لی تھی. اب وہ شیراز صاحب سے بھی ناراض نہیں تھا شاید انھوں نے اسے بہت سمجھایا تھا۔ غصہ تھا تو صرف علایا پر۔

اسے یاد آیا تھا کہ کیسے وہ زاویار کے ساتھ اکثر کسی پارک میں چلے جاتا اور وہ دونوں پارک کے واکنگ ٹریک پر خوب واک کرتے اور جب تھک جاتے تو وہاں بنی بینچ پر بیٹھ جاتے اور ڈھیر ساری باتیں کرتے۔۔

زاویار کوئٹہ جانے کا کیا پلان ہے؟ احمر اور وہ پارک میں بینچ پر بیٹھے گفتگو میں مشغول تھے جب ہی احمر نے کسی خیال کے تحت اس سے پوچھا۔

آ...ہاں میں ابھی کراچی میں سیٹل ہو جاؤں پھر ماما پاپا کو بھی یہاں لے آؤں گا. کوئٹہ جانے کا ارادہ نہیں ہے میرا.. وہ اسے اپنا پلان بتاتے ہوئے بولا۔

ان چار سالوں میں تو ایک بار بھی کوئٹہ نہیں گیا؟ وہ جیسے حیران تھا۔

بس یونہی.... وہ شانے اچکاتے ہوئے بولا۔

تو تو کیا کراچی میں علایا کی وجہ سے سیٹل ہونا چاہتا ہے۔تو علایا کو پسند کرتا ہے نا؟اس نے اچانک سوال کیا اور سوال اتنا تیزی سے آیا تھا کہ زاویار خود بھی حیران ہوا تھا۔

اس نے گردن موڑ کر احمر کو دیکھا،وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا.اس کے چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔

نن...نہیں...یہ کس نے کہا؟اس نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

تیرے دل نے بتایا مجھے...جب ہی تو کچھ نہیں بولتا اسے...وہ کتنا جیلس ہوتی ہے تجھ سے اور تو اسے کچھ نہیں کہتا..تجھے اس پر غصہ نہیں آتا؟اب وہ اسے مزید کریدنے لگا..

یہ دوست ایسے ہی ہوتے ہیں کسی سے محبت نا بھی ہو یہ دوست بول بول کر کروا دیتے ہیں..احمر بھی اس کے سامنے ہر وقت یہی تسبیح پڑھتا رہتا تھا.جب ہی تو اس کی پسندیدگی اب محبت میں بدلنے لگی تھی مگر وہ اس بات کا اقرار نہیں کرتا تھا۔

پارک میں موجود بچے جو شور و غل مچا رہے تھے،زاویار احمر کی بات کا جواب دینے کے بجائے ان بچوں کو دیکھنے لگا۔

ویسے میں حیران ہوں۔تیرا دل آیا بھی تو اس ہٹلر کی بہن پر۔مجھے اس کا ایٹیٹیوڈ پسند نہیں۔تجھے کیسے پسند آگئی وہ بد تمیز لڑکی جسے صرف لوگوں کے دل توڑنے سے مطلب ہے۔

سچ بتا تجھے اس پر واقعی غصہ نہیں آتا؟ وہ حیران سے پوچھ رہا تھا۔

"دنیا میں اللہ آپ کیلئے کوئی نہ کوئی انسان ایسا ضرور بناتا ہے۔ جس کی کوئی بات آپ کو بری نہیں لگتی، جس پر آپ کو کبھی غصہ نہیں آتا، جس کے ہاتھوں ذلیل ہو کر بھی آپ کو اپنی بے عزتی محسوس نہیں ہوتی اور اگر وہ شخص آپ سے محبت نہیں کرتا تو بھی اس شخص کیلئے آپ کی محبت کم نہیں ہوتی۔" شاید میرے لئے وہ لڑکی علایا ہے۔

علایا سے کیوں نہیں بول دیتا؟ احمر نے اپنے دوست کی اداسی اس کے الفاظ سے بھانپ لی تھی۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

یہ سچ ہے کہ میں اسے بہت پسند کرتا ہوں، یہ بھی سچ ہے کہ میرا دل ناچاہتے ہوئے بھی اس سے محبت کرنے لگا ہے.. میں اس کی وجہ سے اپنے مقصد سے پیچھے ہٹنے لگا ہوں.. میں یہاں جس مقصد کیلئے آیا تھا وہ مجھے ادھورا ہی نظر آتا ہے.. مجھے ایک بات کا دکھ ہوتا ہے احمر... کہ علایا کو اپنے اوپر بہت غرور ہے اور میں سوچتا ہوں کہ جب اس کا غرور ٹوٹے گا تو وہ کیا کرے گی؟ میں بس یہ ہی سوچ کر خاموش ہو جاتا ہوں.. وہ بے خیالی میں نا جانے کیا بول رہا تھا، احمر کو تو ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آئی تھی۔

احمر جو اسے ہی دیکھ رہا تھا اور زاویار کی نظریں دور کھیلتے ہوئے بچوں پر مرکوز تھیں. وہ

خاموشی سے اسے دیکھتا گیا تھا۔

وہ اپنے آفس میں سوچوں میں ڈوبا تھا کہ اچانک گیٹ پر دستک ہوئی اور ایک لڑکی جو نارمل سے قد کی تھی اندر داخل ہوئی۔

سر...علایا ملک آپ سے ملنا چاہتی ہیں..میں نے انھیں لاکھ بار منع کر دیا ہے کہ آپ ان سے نہیں ملنا چاہتے وہ پھر بھی آفس آ گئی ہیں.اس نے اسے انفارم کیا تھا۔

احمر جو اپنی کرسی پر بیٹھا تھا فوراً ہی کرسی سے اٹھا.چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ امڈ آئی تھی۔

اس نے اپنی گردن اثبات میں ہلائی گویا اسے اندر بھیجنے کی اجازت دی ہو۔

انتقام،انتقام ہائے رے انتقام۔۔۔۔دل نے جیسے ایک صدا لگا کر اسے یاد دلایا تھا۔

احمر اس وقت کوٹ پینٹ پہنے اپنی ٹیبل کے پاس گیٹ کی طرف پیٹ کئے ہوئے کھڑا تھا.اس نے اپنے ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈال رکھے تھے.جب ہی وہ اندر داخل ہوئی۔

ملک آف انڈسٹریز کی اکلوتی وارث احمر شیراز سے ملنے کے لئے اتنا گڑگڑائے گی..میں نے کبھی نہیں سوچا تھا.وہ طنز کرتے ہوئے بولا۔

علایا اس وقت سفید رنگ کی شارٹ فراخ پہنے ہوئے تھی. اس کے چہرے کی رنگت گلابی تھی مگر اس وقت اس کے چہرے پر کوئی رونق نہیں تھی. بال اونچی پونی میں لپیٹے اور پیروں میں اونچی ہیلز پہنے وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

احمر میں تم سے دوٹوک بات کرنے آئی ہوں۔

اس کی آواز میں کچھ تھا کہ احمر نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

لیکن میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا. وہ سپاٹ سے لہجے میں بولا۔

احمر۔۔۔۔مجھے سچ میں اس بات کا بہت افسوس ہے کہ۔۔۔۔میری وجہ سے تمہارا دوست تم سے دور ہوا، مگر میرا یقین کرو وہ ایک حارثہ تھا اور حادثے ایسے ہی ہوتے ہیں اچانک۔وہ جیسے اسے سمجھانے آئی تھی۔علایا ملک اسے کیوں سمجھانے آئی تھی؟ تم یہاں کیوں آئی ہو۔۔اس نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔اس نے اس کی بات کو اگنور کیا تھا جیسے اسے اس کی کسی بات سے کوئی فرق پڑا ہی نہ ہو۔

احمر.....میں ایک بار اس کی فیملی سے ملنا چاہتی ہوں..اس کا چہرہ بجھا بجھا تھا. وہ اسے وہ علایا نہیں لگی تھی جسے وہ جانتا تھا۔

تمہیں اس سے اور اسکی فیملی سے اتنی ہمدردی کیوں ہو گئی اچانک؟ وہ حیران ہوا تھا۔

کیونکہ جو ہوا وہ میری وجہ سے ہوا۔

لیکن تم تو یہی چاہتی تھیں نا؟ پھر؟؟ وہ سامنے ٹیبل پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر اسکی طرف جھک کر بولا۔

"انسان کو اس کے الفاظ سے جج کرنا چھوڑ دو احمر.. کبھی کبھی انسان نا چاہتے ہوئے بھی وہ بولتا ہے جو وہ کہنا نہیں چاہتا۔"

اسے اس کے الفاظ پر حیرت ہوئی تھی.. وہ ٹیبل سے اپنے ہاتھ ہٹاتا ہوا سیدھا ہوا پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

احمر نے کھوجتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

کیا چاہتی ہو؟ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

صرف اتنا کہ تم مجھے کوئٹہ لے کر چلو، زاویار کے گھر..... لیکن ڈیڈ کو اس بات کی بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیئے. وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی۔

علایا کی اس بات سے احمر کے لبوں پر مسکراہٹ امڈ آئی.. علایا نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ یا میں تمہیں پاگل لگ رہا ہوں؟ مسکراہٹ ایک دم غائب ہوئی اور وہ لفظ چبا چبا کر بولا۔

وہ آنکھیں سکیڑے اسے دیکھنے لگی،ماتھے پر غصے سے بل پڑنے لگے..احمر نے اس کے چہرے کو دیکھا تو یکدم ہی خاموش ہو گیا...اسے ایک لمحے زاویار یاد آیا تھا وہ بھی اسے غصے میں ایسے ہی آنکھیں سکیڑ کر دیکھتا تھا..اس کے ماتھے پر بھی فوراً بل پڑ جاتے تھے.

اس کا دماغ بھی عجیب ہو گیا تھا دوست کو دوست کے محبوب میں ڈھونڈنے لگا تھا..اس نے اپنا خیال جھٹکا اور اپنی بات جاری کی۔۔

دیکھو علایا.....وہ زاویار تھا جس نے تمھارے لئے اپنی جان خطرے میں ڈال دی کیونکہ وہ تمہیں پسند کرتا تھا۔لیکن میں احمر ہوں...نہ تو میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور نہ میرا تم سے کوئی دلی تعلق ہے جو تمہارے کہنے پر میں اپنی جان کو خطرے میں ڈال دوں...وہ خاموش ہوا تو علایا کی آنکھیں اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔۔

تمہیں کیا لگتا ہے۔۔۔تمہیں وہاں لے جانے پر تمہارے ڈیڈ مجھے چھوڑ دینگے؟؟

نہیں علایا۔۔وہ مجھ پر اغوا برائے تاوان کا کیس کر دینگے۔۔۔میں کسی ایڈونچر میں نہیں پڑنا چاہتا۔۔اس نے ہاتھ ہلا کر اسے منع کیا تھا۔

ڈیڈ کو میں سنبھال لوں گی احمر۔۔۔۔کیا تم اس کے ماں باپ سے ملنا نہیں چاہتے؟؟

اس نے احمر کو لالچ دی تھی۔۔

وہ کچھ لمحے اسکو اصرار کرتا دیکھ کر خاموش رہا۔۔

میرے لئے نا سہی، اپنے دوست کیلئے احمر۔۔۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اس کے گھر والوں کو حقیقت کا علم ہو۔۔۔ میں انھیں حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتی ہوں۔۔۔ شاید جو دل پر بوجھ ہے وہ ہلکا ہو سکے۔۔۔ اس کی آنکھوں میں امید تھی۔

احمر کو تو جیسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کے سامنے بیٹھی یہ لڑکی علایا تھی۔۔۔

میں رات ۹ بجے سی ویو پر تمہارا انتظار کروں گی... میں کوئٹہ اکیلے نہیں جانا چاہتی احمر... زندگی میں پہلی بار تم سے کچھ مانگ رہی ہوں... وہ فوراً ہی کرسی سے کھڑی ہو گئی۔

میں نہیں آؤں گا.. اس نے صاف انکار کیا تھا۔

میں پھر بھی تمہارا انتظار کروں گی.... وہ اٹل لہجے میں کہتی ہوئی باہر آ گئی۔۔

اس کا لہجہ نرم ہوا تھا مگر ضدیں ختم نہیں ہوئی تھیں۔

احمر نے ایک گہری سانس لی۔ وہ کس طرح اپنے غصے کو کنٹرول کر کے بیٹھا تھا یہ وہی جانتا تھا۔ اس کا دماغ ایک نیا منصوبہ بننے لگا۔

انتقام میں جلنے والا اگر پہلے ہی اپنے رویے سے ظاہر کر دے تو دوسرا فوراً ریزرو ہو جاتا

ہے اور احمر یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس سے ریزرو ہو۔

علایا نے احمر پر بھروسہ کیا تھا۔اب یہ احمر پر تھا کہ وہ اس کے بھروسے کا پاس رکھے گا یا انتقام کی رسی کو تھامتے ہوئے اسے اس آگ میں جلائے گا۔

* * * * * * * * *

شام کے چھ بج رہے تھے اور وہ اس وقت تازہ ہوا لینے بنگلے کے لان میں لکڑی سے بنے اس خوبصورت جھولے پر بیٹھے تھے. انھوں نے اپنے ہاتھوں میں نیوز پیپر تھام رکھا تھا. وہ اپنی ساری توجہ نیوز پیپر میں لگائے ہوئے تھے. ہلکی آہٹ ہونے کے باعث انھوں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو علایا چلتی ہوئی آرہی تھی. انھوں نے نیوز پیپر موڑا اور اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

ڈیڈ.... میں کچھ دنوں کے لئے اسلام آباد جانا چاہتی ہوں. اس نے بغیر کسی تمہید کے دوٹوک بات کی۔

اسلام آباد؟؟؟ مگر کیوں؟

میں کچھ دنوں کیلئے یہاں سے دور جانا چاہتی ہوں... انھوں نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔

وہ ایسے ری ایکٹ کیوں کر رہی تھی، انھیں سمجھ نہیں آیا تھا. وہ زاویار کے جانے کے بعد ڈیڈ سے بھی بہت کم بات کرتی تھی۔

ملک صاحب کو ایسا لگا تھا جبکہ وجہ کچھ اور تھی۔

ڈیڈ نے جاپان سے آنے والے گفٹس اس سے چھپائے تھے جس کی وجہ سے اسے غصہ تھا مگر وہ انھیں اس بارے مں خبر دار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ خود اس حقیقت کو ڈھونڈے گی۔ ایسے میں اسے کسی کی مدد درکار تھی۔ اس کے پاس کوئی دوست نہیں تھا۔ وہ احمر سے مدد لے گی۔ اس نے سوچا تھا۔

مگر اس سے پہلے اس نے اپنے اور احمر کے درمیان حائل برف کو پگھلانے کی کوشش کی تھی۔ وہ جان بوجھ کر احمر کے ساتھ جانا چاہتی تھی تاکہ احمر کے ساتھ مل کر وہ ڈیڈ کے کسی راز تک پہنچ سکے۔

کچھ ہی دنوں میں تمہیں جاپان جانا ہے.. پھر ابھی جانے کی وجہ؟

میں تین چار دن یہاں سے دور جانا چاہتی ہوں.. اپنے آپ کو جاننا چاہتی ہوں. وہ ان کے سامنے کھڑی تھی.. ملک صاحب نے نیوز پیپر جھولے پر رکھا اور خود کھڑے ہو گئے. ہاتھ انھوں نے اپنی کمر کے پیچھے باندھ لئے۔

تم جانتی ہو کہ میں نے تمہیں کبھی اکیلے نہیں بھیجا۔۔۔۔

ڈیڈ میں۔۔۔میں۔۔۔اکیلے نہیں جا رہی۔۔۔۔ایمن کے ساتھ جا رہی ہوں۔۔اس کے منہ سے اچانک ہی ایمن کا نام نکلا۔۔وہ خود حیران تھی۔۔۔مگر اب جھوٹ بول ہی دیا تھا تو اب اس پر قائم بھی رہنا تھا۔

ٹھیک ہے۔۔۔ملک صاحب نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

میں آج رات میں نکلوں گی۔۔اس نے انھیں مزید آگاہ کیا۔

آج رات؟انھوں نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

جی۔۔۔میں پیکنگ کرنے جا رہی ہوں۔۔وہ فوراً ہی وہاں سے چلی گئی تھی۔

علایا کا یہ رویہ کیا صرف اس کا پچھتاوا ہے یا کچھ اور۔۔۔۔؟ انھوں نے اسے دور تک جاتے دیکھا۔

علایا بھلے اوپر سے کیسی بھی ہو مگر تھی تو ایک انسان۔۔۔اور انسان ایسا ہی ہے۔۔۔

"سالوں لگتے ہیں نفرت پروان چڑھنے میں مگر محبت کا بیج اگر ایک بار لگ جائے تو اس کی شاخیں لمحوں میں اتنی مضبوطی اور تیزی سے پھیلتی ہیں کہ نفرت کے بیج کو خود ہی مرجھانا پڑتا ہے،اس کی شاخیں کمزور پڑنے لگتی ہیں اور ایسے محبت نفرت پر حاوی ہو جاتی ہے۔انسان کے دل میں اک وقت میں دو فیلینگز کبھی نہیں رہتیں۔۔"

کمرے میں آکر اس نے اپنا بیگ تیار کیا۔

اسے لگا تھا کہ اسے زاویار سے ہمدردی ہونے لگی ہے. دن رات اسی کے بارے میں سوچتی رہتی۔

اسے نو بجے کوئٹہ کیلئے نکلنا تھا. اس نے گھڑی دیکھی تو وال کلاک ساڑھے چھ بجا رہی تھی۔

پتہ نہیں احمر آئے گا یا نہیں؟

اگر وہ نہ آیا تو میں کیا کروں گی؟ اس نے سوچا پھر کسی فیصلے پر پہنچی تھی. نہیں آئے گا تو خود چلی جاؤں گی. پھر کسی خیال کے تحت سائیڈ پر رکھی ہوئی دراز کھولی اور چیک بک نکالی۔

اس کے گھر والوں کو ہر مہینے پیسے بھیج دیا کروں گی... احمر کی باتیں اسے یاد تھیں. زاویار اکلوتا تھا اور ان کا واحد سہارا تھا. امیر لوگوں کے یہی چونچلے ہوتے ہیں... ہر چیز کو پیسوں سے سیٹل کر دیتے ہیں۔

مگر کیا انھیں پیسے دینے سے ان کا بیٹا واپس آجائے گا؟ دل نے اس پر طنز کیا تھا

اس نے چیک بک اپنے پرس میں رکھ لی۔

پھر کمرے میں رکھے اپنے اس چھوٹے گول جھولے میں بیٹھ گئی اس کے بیٹھنے سے جھولا

ہلکا ہلکا ہلنے لگا۔

تھکن کے باعث اس کی آنکھیں بوجھل ہو گئی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کیں اور جھولے کی پشت سے ٹیک لگالی۔ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی اور آہستہ آہستہ وہ نیند کی گہرائیوں میں ڈوبنے لگی۔

* * * * * * * * * *

وہ اسوقت صحرا میں چلتی چلی جارہی تھی۔ اس نے یہاں وہاں دیکھا تو نہ کوئی آدم ہے نہ آدم کی ذات۔ کچھ ہی دیر میں وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ اس صحرا میں بھٹک چکی ہے۔ اس نے سفید رنگ کی لمبی فراخ پہنی تھی جو اس کے پیروں سے بھی نیچے آتی تھی۔ بال اس کے کھلے تھے جو صحرا کی تیز ہواؤں میں اڑ رہے تھے۔ اس نے اپنے قدم تیز کئے اور بھاگنا شروع کیا۔ بھاگنے سے فراخ اس کے پیروں میں آئی اور وہ سیدھا منہ کے بل جا گری۔

اس نے گردن اٹھا کر دیکھا تو صحرا غائب تھا۔ یہ کوئی غار تھی جس میں روشنی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ خوف کے مارے اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ دور کہیں سے پتھروں کی جھری سے اسے روشنی آتی

دکھائی دے رہی تھی. وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی پھر چھوٹے چھوٹے قدم بڑھاتی ہوئی غار کی دیواروں پر ہاتھ لگا کر ٹٹولا. اس نے راستہ تلاشنا چاہا، اسے راستہ نہیں ملا۔

کوئی ہے... اس کی آواز غار کی دیواروں سے ٹکرا کر گونجنے لگی. اس کی آواز میں خوف کی علامت تھی۔

غار بلکل خاموشی میں ڈوبی تھی. اس کا دل اتھل پتھل کرنے لگا۔

اس نے گردن موڑ کر دیکھا تو یہ غار اسے سرنگ کی طرح لگی. چوڑی اور اتنی لمبی جس کا راستہ دور دور تک بھی ختم نہیں ہوتا تھا. کافی دیر اندھرے میں آنکھیں کھلی رکھنے کے باعث اس کی آنکھیں اب دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں. اس نے ایک نظر اس سیدھی سرنگ کو دیکھا پھر وہاں بڑھنے لگی. چوڑی گلی سے گزرتی وہ چلتی چلی جا رہی تھی. کافی دیر گزرنے کے بعد اس نے جیسے رک کر سانس لینا چاہی۔ گرمی سے پیاس کی شدت بڑھنے لگی تھی. اس نے رک کر چند گہرے گہرے سانس لے کہ اچانک اسے دور سے کوئی روشنی نظر آئی تھی. اس نے اپنے قدموں کا رخ اس روشنی کی طرف موڑا. جب ہی اس کے کانوں سے کسی کی آواز ٹکرائی تھی. وہ جیسے جیسے آگے بڑھتی آواز بھی تیز ہونے لگتی. دبے پیروں وہ اس جگہ تک پہنچی جہاں سے اسے روشنی آتی دکھائی دی تھی. یہاں کسی نے لکڑیاں کاٹ کر جلائی تھیں اور یہ اس آگ سے اٹھنے

والے شعلے تھے. جس کے پیچھے وہ آئی تھی. ذرا فاصلے پر ایک آدمی بیٹھا تھا جس نے اس کی طرف پشت کر رکھی تھی. وہ کچھ پڑھ رہا تھا. اس نے قدم قدم بڑھائے اور گھوم کر اس کے سامنے آئی. اس نے حیرانی و پریشانی کے عالم میں اس شخص کو دیکھا وہ علایا کو نہیں دیکھ رہا تھا اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ مسلسل کچھ پڑھ رہا تھا. وہ وہیں اس کے بلکل سامنے بیٹھ گئی۔

اس آدمی کی آواز میں ایسا سحر تھا کہ وہ اس کی آواز میں کھو گئی اور اس کا چہرہ اتنا پیارا تھا کہ وہ اپنی پلکیں جھپکانا ہی بھول گئی تھی. وہ تلاوت کر رہا تھا اور وہ سامنے بیٹھی اسے سن رہی تھی۔

NEW ERA MAGAZINE .com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

ترجمہ:

﴿تم اس ناپائیدار زندگی کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہو﴾ اور اللہ تمہیں دار السلام کی طرف دعوت دے رہا ہے۔ ﴿ہدایت اُس کے اختیار میں ہے﴾ جس کو وہ چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے

سورۃ یُونُس 32

اس نے ترجمہ پڑھتے وقت اسے آنکھیں کھول کر دیکھا وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی. اس

نے پوری توجہ سے یہ ترجمہ سنا تھا۔

لکڑیوں میں لگی آگ یکدم ہی دھیمی ہونے لگی۔

اس شخص نے اپنے پاس رکھا پانی کا پیالہ اسے تھما دیا. اس نے پیالہ تھاما اور گٹ گٹ سارا پانی حلق میں انڈیل لیا۔

کیا تمہیں بھی سیدھے راستے کی تلاش ہے؟ اس نے دھیمی آواز میں اس سے پوچھا تھا۔

وہ اس کے سامنے اپنے گھٹنے موڑے بیٹھی تھی. اس کی سفید فراخ پر جگہ جگہ مٹی کے دھبے لگ چکے تھے۔

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں اس غار میں بھٹک گئی ہوں.. اس نے غار کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔۔

میں بھی یہاں بھٹک گیا ہوں۔۔

علایا کا منہ حیرانی سے کھل گیا۔

ہم مل کر سیدھا راستہ ڈھونڈ لینگے.. وہ پرامید تھی. اس نے زندگی میں کبھی ہارنا نہیں سیکھا تھا۔

تمہارے اور میرے سیدھے راستے میں بہت فرق ہے. وہ اس وقت سفید شلوار قمیض میں ملبوث تھا. آگ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور وہ اسے بلا کا خوبصورت لگ رہا تھا. ہاں یہ وہی تو تھا جو اس سے دور چلا گیا تھا پھر وہ کیوں اس سے ملنے آئی تھی؟

. کیا مطلب؟ علایا نے ابرو اٹھا کر پوچھا

تم جس راستے کی تلاش میں ہو وہ تمہیں اس غار سے باہر نکال کر واپس اسی دنیا میں لے جائے گا... جس دنیا میں تم پہلے ہی بھٹکی ہوئی ہو... اور میں جس راستے کی تلاش میں ہوں وہ دار اسلام ہے.. اس کے چہرے پر دھیمی مسکراہٹ تھی۔

وہ ناسمجھی سے اسے دیکھے گئی۔

تمہیں پتہ ہے دار اسلام کیا ہے؟

دار اسلام سے مراد جنت ہے اور اس کے معنی ہیں سلامتی کا گھر، وہ جگہ جہاں کوئی آفت، کوئی نقصان، کوئی رنج اور کوئی تکلیف نہ ہو.. جہاں صرف امن اور سکون ہو... کوئی آپ سے حسد نہ کرتا ہو. اس نے اس سے سوال کر کے خود ہی جواب دے دیا۔

وہ خاموش ہوا تو چند لمحے یونہی خاموشی رہی۔۔

دار اسلام تک رسائی کیسے حاصل ہو گی؟ علایا نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

وہ علایا کو نہیں دیکھ رہا تھا۔

دار اسلام تک پہنچنے کیل ئے تمہیں دنیا کو بھولنا ہو گا۔

لیکن یہ دنیا بھی تو اللہ نے ہی بنائی ہے۔ پھر ہم کیوں اسے بھول جائیں؟

میں ایک امیر اور کامیاب آدمی کی بیٹی ہوں۔ کافی لوگ مجھے میرے نام سے جانتے ہیں۔ دنیا کی ہر آسائش میرے پاس موجود ہے۔ جو میں چاہتی تھی مجھے ملا ہے۔ نام، عزت، دولت اور یہ سب مجھے اس دنیا میں ملا ہے۔ میں کیسے اس دنیا کو بھول جاؤں؟

تمہیں نام، عزت، دولت اور دنیا کی پرواہ ہے۔ اپنے اعمال کا کوئی خوف نہیں؟

وہ اسے نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ اس کی نگاہیں آگ کے اٹھتے ہوئے شعلوں پر تھیں۔

وہ خاموشی سے بیٹھی اسے دیکھے گ ئی۔

"آپ ﷺ کہہ دیج ئے کہ کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے کون سے لوگ ہیں؟ جن کی ساری جدوجہد صرف اسی دنیاوی زندگی کے ل ئے ہے اور وہ یہ خیال کر رہے ہیں کہ وہ بڑے کامیاب ہیں؟"

(سورۃ الکھف ۱۰۳۔۱۰۴)

اس نے سورۃ الکھف کا ترجمہ پڑھا تھا۔

اس شخص کی باتیں سیدھا اس کے دل میں اتر رہی تھیں۔ یکدم ہی وہ اداس ہو گ ئی۔

دل کی صدائیں زبان تک آنے لگیں۔

ٹھیک تو کہہ رہا تھا وہ۔اسی دنیا کے لئے تو تھی اس کی ساری جدوجہد۔اسی دنیا کے پیچھے تو بھاگ رہی تھی وہ۔

انسان وہی کچھ سیکھتا ہے جو اسے سکھایا جاتا ہے مگر علایا ہر انسان کے دو روپ ہوتے ہیں۔ایک وہ جسے وہ سب کے سامنے ظاہر کرتا ہے اور دوسرا وہ جسے وہ خود بھی ٹھیک سے نہیں سمجھ پاتا۔

میں تمہیں بتاؤں کہ تم کیا کرو۔۔؟تم ایسا کرو کہ اپنے اندر کو پہچانو۔اپنے آپ کو جانو۔

NEW ERA MAGAZINE .com
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

وہ اسے کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا تھا۔یکدم ہی لکڑیوں میں جلتی ہوئی آگ بجھ گئی۔پھر وہی اندھیرا تھا۔اس نے گردن اوپر کی تو وہاں کوئی نہ تھا۔وہ چلا گیا تھا۔دور بہت دور۔اس نے اپنے گھٹنے اوپر کئے اور بازوان کے گرد حائل کئے پھر اپنی تھوڑی اپنے گھٹنوں سے ٹکا دی۔اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کی زندگی ایسے ہی تو تھی بلکل تاریک اور تنہا۔اس کا دل گھبراہٹ کے مارے تیز تیز دھڑکنے لگا۔اس کا پورا وجود پسینے میں بھیگنے لگا تھا۔

یکدم ہی اس کی آنکھ کھلی تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔کمرے میں بلکل ویسی خاموشی تھی

جیسی غار میں تھی۔اسے کچھ وقت لگا تھا اس خواب سے نکلنے میں۔

اوہ خدا۔۔یہ کیا دیکھا تھا اس نے۔۔؟اس نے تاسف سے اپنے ماتھے کو چھوا۔

ہاں وہ وہی تھا۔

زاویار سکندر۔۔۔۔مگر وہ اس کے خواب میں کیوں آیا تھا؟

وہ اسے خواب میں بے دار کرنے آیا تھا۔

ہاں وہ اسے خواب میں بے دار کرنے آیا تھا۔

انسان خواب میں وہی دیکھتا ہے جس کے بارے میں وہ سوچتا ہے۔تو وہ اس کے بارے میں سوچنے لگی تھی؟وہ کیوں اس کے بارے میں سوچنے لگی تھی؟

اسنے گھڑی دیکھی۔آٹھ بج رہے تھے۔وہ تیزی سے واش روم کی طرف بڑھی۔اسے کوئی ٹہ کیل ئے روانہ ہونا تھا۔

* * * * * * * * * *

وہ اپنی بلیک مرسیڈیز لے کر نکلی تھی۔ڈیڈ سے اس نے کہہ دیا تھا کہ ایمن کے ڈیڈ نے ڈرائی یورار یخ کیا ہے مگر وہ اپنی گاڑی میں ہی جانا چاہتی ہے۔وہ ملک صاحب کے ڈرائی یور کو نہیں لے جانا چاہتی تھی۔

گاڑی اپنے رستے پر رواں دواں تھی. اس کے دل و دماغ پر احمر کی باتوں کا گہرا اثر ہوا تھا. اس نے ڈیڈ سے وہی سوالات پوچھے تھے جو احمر نے اس سے کئے تھے. ڈیڈ نے اسے سمجھا دیا تھا کہ یہ سب انھوں نے اس کے لئے ہی کیا ہے. وہ میڈیا پر علایا کے متعلق کوئی خبر سننا نہیں چاہتے تھے۔ پورے راستے اس کے ذہن میں ابھی تھوڑی دیر پہلے دیکھے جانے والا خواب گھوم رہا تھا۔ علایا کو صحیح معنوں میں زاویار کی موت نے بدل کر رکھ دیا تھا. جس شخص کو آپ نقصان پہچانا چاہتے ہوں، جس کا آپ نے کبھی بھلا نہ چاہا ہو، وہ شخص اگر آپ کو فائدہ پہنچا دے تو اس کی عزت آپ کے دل میں بڑھنے لگتی ہے. یہی علایا کے ساتھ ہوا تھا. کوئی دن ایسا نہیں تھا کہ وہ زاویار کے بارے میں نہ سوچتی ہو. ہر لمحے ہر وقت اس کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتا تھا. اس کی باتیں اس کے کانوں میں گونجنے لگی تھیں. وہ تیزی سے اپنی گاڑی کو اسی جگہ لے آئی جہاں یہ حادثہ ہوا تھا۔

گاڑی میں بیٹھے بیٹھے وہ سوچتی رہی پھر اس کے الفاظ کانوں میں گونجے۔

یہ کوئی جاپان یا پیرس نہیں جہاں کرائم ریٹ زیرو ہو. اس نے آس پاس دیکھا تو پھر وہی سناٹا تھا. وہ یہاں کیوں آئی تھی؟ دماغ نے اس سے سوال کیا تھا۔

علایا... اللہ نے تمہیں رہبری سے محروم رکھا ہے. کسی نے اس کے کان میں کہا تھا.

اس کا پورا وجود یکدم سن سارہ گیا تھا. یہ روڈ بلکل ویسے ہی ویران پڑا تھا جیسے اس دن تھا.

اس نے گاڑی آگے بڑھادی۔

رہبری؟ کیا واقعی میں رہبری سے محروم ہوں؟ اس نے اپنے دل سے سوال کیا تھا۔

دل بلکل خاموش رہا۔

اسے یاد تھا خواب میں اس نے کہا تھا کہ وہ اپنے آپ اندر کو جانے۔ اپنے آپ کو پہچانے۔

وہ گاڑی بھگاتی ہوئی سمندر پر لے آئی. گاڑی کنارے پر لگا کر وہ باہر نکلی تو رات کے اس پہر میں ٹھنڈی ہواؤں نے اس کا استقبال کیا۔

چوڑے فلیپر پر اس نے اسٹائلش سی شرٹ پہن رکھی تھی اور بالوں کو اونچی پونی میں باندھ رکھا تھا۔

وہ سینے پر ہاتھ لپیٹے تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی سمندر کی طرف بڑھ رہی تھی۔

ابھی کچھ مہینوں پہلے ہی تو وہ یہاں ٹکرائے تھے. اسے یاد آیا تھا. یہاں کھڑے ہو کر میں نے اسے دھمکی دی تھی. وہ ٹھیک اس جگہ پر کھڑی تھی جہاں وہ پہلے کھڑے ہوئے تھے۔

رات کے وقت بھی سی وی یو کا منظر کافی خوشگوار تھا. کافی لوگ یہاں موجود تھے.

زیادہ تر لڑکوں کی ٹولیاں تھیں جو لڑکیوں کے ساتھ سیر و تفریح کو آئے ہوئے تھے۔

علایا کی کبھی کسی لڑکے سے کوئی دوستی نہیں رہی تھی. وہ لڑکوں سے تقریباً چڑتی تھی

اور اس بات کا سب سے بڑا گواہ زاویار سکندر خود تھا۔

یونی میں تو ایک وقت میں وہ فیمینسٹ کے نام سے بھی مشہور ہو گئی تھی۔

وہ تیز قدم بڑھاتی ہوئی سمندر کے کنارے پر آ گئی. دیر تک ان لہروں کو اپنے قریب آتا

دیکھتی اور وہ اس کے پاؤں بھگو کر آگے نکل جاتیں۔

وہ احمر کا انتظار کرنے لگی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ وہ نہیں آئے گا مگر پھر بھی اسے

تھوڑی سی امید تھی اور وہ اسی امید کو تھامے اس کا انتظار کرنے لگی۔ اسنے اپنے آپ

میں بہت کچھ محسوس کیا تھا۔

زاویار کو اس نے نہیں مارا تھا مگر اگر آپ کی وجہ سے کوئی اپنی جان سے چلا جائے تو آپ

پل پل اس اذیت کو محسوس کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ بھی ایسا ہوا تھا۔

ایک حادثہ انسان کو بدل دیتا ہے مگر اس حادثے میں علایا کا کوئی نقصان نہیں ہوا تھا. پھر

بھی وہ بے سکون تھی اور اب بھی اس سب کی وجہ زاویار سکندر تھا. وہ پوری طرح اسکی

سوچ پر سوار ہو گیا تھا۔

کوئی وقت ایسا نہیں تھا جب اسے اس بات کا خیال نہیں آتا تھا. وہ پہلے کبھی کبھی اسے نظر آتا تھا تو وہ اس کو تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی مگر اب وہ ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے گردش کرتا تھا اور وہ چاہ کر بھی اسے کچھ نہیں کر پاتی تھی۔اب تو وہ اس کے خوابوں میں بھی آنے لگا تھا۔ کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں جا کر وہ اس سے فرار پا لیتی۔

کوئی راہ ایسی تھی ہی نہیں جس سے فرار ہوا جاتا۔

وہ تو دل میں بسنے والا تھا، وہاں سے کیسے نکالا جاتا؟

زاویار سکندر جتنا تم نے مجھے اپنی زندگی میں ستایا ہے، اس سے کہیں زیادہ تم میری زندگی سے چلے جانے کے بعد مجھے رلا رہے ہو. تم اپنے وجود کی طرح اپنے سائے کو ساتھ لے کر کیوں نہیں گئے؟ آخر کار اس کے دل نے زاویار سے سوال کر ہی ڈالا تھا۔

کیونکہ وہ تم سے محبت کرتا تھا.. دل نے فوراً جواب دیا تھا۔

ایسا کچھ نہیں تھا.. احمر جھوٹ بول رہا ہے.. اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔۔

آسمان پر بادلوں نے ڈیرے ڈالے. تیز ہوا بادلوں کو اڑاتی ہوئی علایا کے سر پر لے آئی تھی. چاند بادلوں میں کہیں چھپ گیا تھا۔

احمر جھوٹ نہیں بول رہا تم جھوٹ بول رہی ہو..دل اس پر برس پڑا تھا۔

اور کب تک علایا...اور کب تک...تم مان کیوں نہیں لیتیں کہ تمہیں اس سے محبت ہو گ ئی ہے۔۔۔

وہ شل سی کھڑی رہ گ ئی۔اسے لگا تھا کہ کسی بھاری سل سے اس کے دل کو کچلا گیا تھا۔

وہ یہاں کھڑی اپنے دل سے ہمکلام تھی۔شاید اپنے اندر کو جاننا چاہتی تھی۔آج وہ اپنے دل کی سننا چاہتی تھی۔مگر دل تو اسے کچھ اور ہی سنا رہا تھا۔

نن۔۔۔نہیں۔۔۔۔۔وہ بیگانگی کے عالم میں بولی۔

یہ دل اس سے کیسی باتیں کر رہا تھا۔

اسے اپنا وجود اس ریت کی مانند لگ رہا تھا جو سمندر کے پانی کے زیر اثر گیلی اور چپچپی ہو گ ئی تھی۔

یہ اس پر کیسا انکشاف ہوا تھا۔

محبت۔۔۔۔اور میں۔۔۔۔وہ بھی زاویار سکندر سے؟وہ جیسے حیران ہوئی تھی۔

تمہیں لگتا ہے یہ محبت ابھی ہوئی ہے؟

نہیں علایا۔۔۔تم شروع دن سے ہی اس کم حیثیت انسان کی محبت میں مبتلا ہو گ ئی

تھیں۔

لیکن تم نے کیا کیا؟اس کی حیثیت اور اپنی محبت کو بھی کمتر اور اعلی کے پلڑے میں تولنا شروع کر دیا اور آخر میں کیا ہوا؟اس کی حیثیت کا پلڑا بھاری رہا اور تم نے اپنی محبت سے دستبرداری دے دی. تم نے اسے اٹھتے بیٹھتے ذلیل کیا کہ تمہارے دل سے اس کی محبت ختم ہو جائے۔۔۔کیوں؟کیونکہ وہ تمہارے ڈیڈ کی طرح امیر نہیں تھا...کیوں کیا تم نے ایسا علایا؟

اس کے دل کی آواز نے وہ شور برپا کیا کہ ایک آنسو اس کی آنکھ سے لڑکا۔

پاؤں کے نیچے سے زمین سرکنے لگی تھی۔۔دل اس سے کیا کہہ رہا تھا وہ ہر بات ماننے سے انکاری تھی۔

"محبت کبھی بھی حیثیت دیکھ کر نہیں کی جاتی علایا ملک، تمہارا دل اسے ہمیشہ سے پسند کرتا تھا مگر وہی تمہارے بڑے بڑے دعوے کرنے والی عادت نے تمہیں ہمیشہ اس اعتراف سے روکے رکھا. "سمندر کے طوفان کی طرح دل میں بھی طوفان مچا تھا۔

لوگ کیا کہتے کہ اتنے بڑے سیاستدان کی بیٹی نے ایک معمولی انسان سے محبت کر لی؟

لوگوں کی نظر میں ڈیڈ کی کیا عزت رہ جاتی؟یہ ہی سب سوچا تھا نا تم نے؟

وہ میرے راستے کا سب سے بڑا کانٹا تھا۔ میں نے کبھی اس کے بارے میں نہیں سوچا۔

اس نے اپنے دل کو دلیل پیش کی تھی۔

لیکن یہ جو دل ہوتا ہے نا یہ محبت کے معاملے میں بڑا عجیب ہوتا ہے. یہ ایسا منتر پڑھتا ہے کہ دل کا فیصلہ دماغ پر بھی بھاری ہو جاتا ہے. یہ محبوب کے معاملے میں نہ کسی دلیل کو مانتا ہے نا اس کے خواب دیکھنے سے بے زار ہوتا ہے. علایا کے ساتھ بھی یہی سب ہو رہا تھا. سمندر کے شور سے کہیں زیادہ شور اس کے دل نے مچایا ہوا تھا۔

جھوٹ پھر جھوٹ۔۔۔۔۔۔ تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے لیکن تم دونوں کے درمیان ایک بہت بڑی دیوار حائل ہو گئی جس نے تم دونوں کو اظہار سے روکے رکھا اور وہ دیوار تھی انا کی دیوار۔

تمہاری انا تمہیں ایک دن لے ڈوبے گی۔ دل آج بلکل سچ بول رہا تھا۔ اسے خبر بھی نہ تھی کہ دل کیا کیا سوچتا رہا تھا۔

وہ کس دھوکے میں رہی تھی؟

علایا۔۔۔

کسی نے بڑی زور سے اس کے پیچھے کہا تھا. اس آواز پر وہ چونکی اور پلٹ کر اسے دیکھا. وہ حیران آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ علایا کو دیکھ کر مسکرایا تھا۔

اسنے اسے دیکھا پھر ایک گہری سانس اندر کھینچی۔وہ آگیا تھا۔

اسے آنا تھا۔علایا ملک سے بدلا لینے کا صحیح وقت تھا۔وہ کیسے یہ موقع جانے دیتا؟

تو تم میرے ساتھ جانے کیلئے آئے ہو؟

میں تمہارے لئے نہیں،اپنے دوست کیلئے آیا ہوں..احمر کے بال ہوا سے بکھرے بکھرے ہو گئے تھے.اس نے ہلکی ٹی شرٹ اور جینز کی پینٹ پہن رکھی تھی.وہ آچکا تھا مگر علایا اپنی باتوں میں اتنی مگن تھی کہ اس نے اسے نہیں ٹوکا تھا۔

تم انکل کو بتا کر آئی ہو نا کہ تم کوئٹہ جا رہی ہو وہ بھی میرے ساتھ؟اس نے سوال کیا تھا.۔

آ۔۔۔ہاں میں نے بتا دیا۔اس نے گردن کو ہلکی سی جنبش دی۔

احمر نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

انکل مان گئے؟وہ حیران ہوا تھا۔

ہوں۔۔۔۔اس نے یک لفظ جواب دیا اور پھر واپس گاڑی کی طرف چل پڑی۔احمر نے اسے جاتے دیکھا پھر ایک مسکراہٹ سے اپنے شانے جھاڑ کر اس کے پیچھے ہو لیا۔

* * * * * * * * * * *

*

شیراز صاحب اپنے کمرے میں راکنگ چیئر پر بیٹھے تھے۔انکی چیئر ہلکی ہلکی جھول رہی تھی۔اپنے دونوں ہاتھ انھوں نے کرسی کے ہتھوں پر ٹکا رکھے تھے۔وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے تھے.بیڈ پر رکشندہ بیٹھی تھیں۔وہ اپنے ہاتھوں پر لوشن مل رہی تھیں۔ بال ان کے لیئر اسٹائل میں کٹے تھے۔ان کی نظریں مسلسل شیراز صاحب پر ٹکی تھیں۔

سنیں۔۔۔رکشندہ نے بہت سوچ کر انھیں مخاطب کیا تھا۔ہر مشرقی بیوی کی طرح وہ بھی اپنے شوہر کا نام نہیں لیتی تھیں۔

شیراز صاحب نے گردن ان کی طرف موڑی۔

آپ کن خیالوں میں کھوئے ہیں؟وہ پریشانی سے بولیں۔

شیراز صاحب اپنی کرسی سے اٹھے اور قدم بڑھاتے ہوئے بیڈ پر آ گئے۔

کچھ خاص نہیں۔بس احمر کی وجہ سے پریشان ہوں۔ وہ اپنی ٹانگیں بیڈ پر سیدھی کرتے

ہوئے بولے۔انھوں نے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگالی تھی۔

رکشندہ نے ایک اچٹتی ہوئی نظران پر ڈالی۔

اب اسنے کیا کیا؟اب تواس نے خاموشی لگالی ہے۔وہ جیسے ان کے پریشان ہونے پر حیران تھیں۔

یہی تو بات ہے کہ اس نے خاموشی لگالی ہے۔انھوں نے اپنی گہری نظروں سے انھیں دیکھا۔

مطلب؟وہ جیسے نا سمجھی سے انھیں دیکھ رہی تھیں۔

کچھ نہیں۔۔۔۔میں بس اتنا چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد اس کی شادی کردوں۔وہ کسی نتیجے پر پہنچ چکے تھے۔فیصلہ وہ کر چکے تھے۔بیوی کی رائے سے کوئی فرق نہیں پڑنا تھا یہ وہ جانتی تھیں۔

مگر ابھی تواس نے آفس جانا شروع ہی کیا ہے۔یہ ذمہ داری بہت بڑی ہے۔وہ شاید اس فیصلے پر فی الحال راضی نہیں تھیں۔

ردا کیسی رہے گی اس کیلئے؟انھوں نے رکشندہ کی تمام بات کو اگنور کیا اور ان سے رائے مانگی۔

ردا۔۔۔۔؟؟احمر کی مرضی کے بغیر میں کیا کہہ سکتی ہوں؟وہ حیران ہو گئی تھیں۔

ہاں۔۔گھر کی لڑکی ہے۔۔۔پیاری ہے،پڑھی لکھی ہے اور اسے کیا چاہیئے؟تم اپنی رائے دور کشندہ۔۔۔اسے میں دیکھ لوں گا۔

ٹھیک ہے۔۔۔اگر آپ کو احمر کیلئے ردا پسند ہے تو میں بھی آپ کے فیصلے سے راضی ہوں۔اچھی بیوی کی طرح انھوں نے شوہر کے خلاف نہیں جانا تھا۔

وہ کسی ضروری کام سے لاہور گیا ہے۔وہاں سے آجائے تو میں بات کروں گا اس سے۔۔اس سے پہلے کے وہ کسی اور مسئلوں میں گھرے،اسکی شادی کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیئے۔ان کا دماغ انھیں کسی خطرے سے بار بار آگاہ کر رہا تھا۔

آپکو اسے اکیلے لاہور نہیں بھیجنا تھا۔۔رکشندہ ذرا خفا ہو گئی تھیں۔

میں نے تو ناصر کو بھیج دیا تھا مگر یہ خود جانا چاہتا تھا اور میں اسے منع نہیں کر سکا۔اب جب کہ وہ اپنا دھیان بزنس میں لگا رہا ہے تو میں اسے روک نہیں سکتا۔رات کی فلائیٹ سے گیا ہے۔ایک دو دن میں آجائے گا۔وہ جیسے پر امید تھے مگر وہ کیا جانیں کے کاروبار کرنے والا اور لوگوں کے اصل چہروں سے واقف ہونے والا اپنے بیٹے کی معصومیت سے دھوکا کھا گیا ہے۔

ان کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ وہ ان سے بزنس کی میٹینگ کا کہہ کر ملک ریاض کی بیٹی علایا ملک کے ساتھ اس وقت کوئی ٹہ کے سفر پر روانہ ہے۔

علایا اور احمر نے اتنی صفائی سے جھوٹ بولا کہ ملک اور شیر از اپنے اپنے کمروں میں آنکھیں بند کئے نیند کی آغوش میں چلے گئے تھے۔

مگر کون جانے کہ ان کی یہ سکون کی نیند کب تک برقرار رہتی ہے۔

****

رات کی تاریکی میں بھی ایک عجیب سی وحشت ہوتی ہے۔یہ خاموش مگر راضوں سے بھرپور ہوتی ہے۔کوئی اس سیاہ رات میں اپنے برے فعل انجام دے رہا ہوتا ہے تو کوئی اپنے کئے گئے برے افعال پر نادم ہو کر خدا کے حضور سجدے میں اسے منانے کی جستجو میں ہوتا ہے،اس تنہا اور تاریک رات میں کوئی سکون سے سوتا ہے تو کوئی جی بھر کے روتا ہے۔

اسی سیاہ رات میں علایا ملک اپنی سیاہ مرسیڈیز میں احمر کے ساتھ ایک سفر کا آغاز کر چکی تھی۔گاڑی میں بیٹھے انھیں کوئی چار گھنٹے گزر چکے تھے۔رات کے دو بج رہے تھے اور

گاڑی احمر ڈرائی یو کر رہا تھا۔ گھنے جنگلوں کے بیچ چلتی ہوئی گاڑی کو دیکھ کر علایا کا دل ڈوب کر ابھرتا تھا۔ ایک تو اس نے کبھی اتنا لمبا سفر گاڑی میں نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ سے ہوائی سفر کرتی تھی مگر یہ پہلا سفر تھا جو وہ کار میں کر رہی تھی اور وہ بھی اس شخص کے ساتھ جو اس سے شدید نفرت کرتا تھا۔ یہ وہ اچھی طرح جانتی تھی مگر اس نے لمبے راستے کا انتخاب اس لئے کیا کہ وہ احمر کے دل سے اپنے لئے برائی نکال سکے اور اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا سکے۔ وہ احمر سے مدد چاہتی تھی۔ ڈیڈ اور شیرا زانکل بزنس میں پارٹنر رہے تھے اور کافی اچھے دوست بھی تھے۔ وہ احمر کے ذریعے جاننا چاہتی کہ کیا اس کے ڈیڈ کا کوئی ویک پوائینٹ ہے جس سے وہ بے خبر تھی؟

اسے احمر پر یقین تھا کہ وہ ضرور ملک صاحب کا ویک پوائینٹ ڈھونڈنے میں اس کی مدد کرے گا۔

خیالوں میں گم وہ تیزی سے گزرتے ہوئے جنگل کے درختوں کو دیکھ رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی گاڑی زن سے ان کی گاڑی کے برابر سے گزرتی تو وہ ڈر جاتی تھی۔

پتہ نہیں اس پر بھروسہ کرنا بھی چاہئے تھا یا نہیں۔۔۔ اس نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

اب بھروسہ کیا ہے تو خوف کو دل میں جگہ نہیں دینی چاہئے۔ دل نے ہنکارا بھرا۔

احمر گاڑی چلاتے ہوئے ایک سرسری نگاہ اس پر ڈال دیتا۔ کون جانے کہ اس کا دل اور دماغ کس جنگ میں الجھا ہوا تھا۔

موقع اچھا ہے کسی کو خبر نہیں ہو گی۔۔۔اور میں اس کا غرور خاک میں ملا دوں گا۔

ملک صاحب نے جو تھپڑ اسے بند کمرے میں مارا تھا اس کا جواب وہ ان کی بیٹی کو بھری محفل میں رسوا کر کے دے گا۔اس نے اسی وقت سوچ لیا تھا اور اب اس کے پاس گولڈن چانس تھا جو قدرت کی طرف سے اسے ملا تھا ورنہ علایا کہاں اس کے ہاتھ آنی تھی؟

زاویار کو کیا منہ دکھاؤں گا؟اسکی محبت کی حفاظت نہیں کی میں نے؟اس محبت کی جس کے لئے اس نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال دیا۔دل میں زاویار کا خیال آیا تو اس نے ایک نظر بھر کر اپنے برابر میں بیٹھی اس لڑکی کو دیکھا،جو سیٹ سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے ہوئے تھی۔وہ نا جانے کیوں اسے زاویار میں ہی ملتی ہوئی لگتی تھی۔

اسنے سر جھٹکا اور توجہ سامنے کی طرف مرکوز کر لی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے علایا سے کہہ دیا تھا کہ میں سفر میں بات نہیں کرتا تو علایا بھی پھر علایا تھی۔اپنی عزت اسے عزیز تھی۔ایک بار جب احمر نے اسے منع کر دیا تھا تو وہ لاکھ چاہ کر بھی اس سے بات نہیں کر پائی تھی۔

علایا۔۔۔پانچ گھنٹے بلکل خاموش رہنے کے بعد اللہ اللہ کر کے اس کی خاموشی ٹوٹی۔وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔

علایا جس نے یونہی آنکھیں بند کر رکھی تھیں فوراہی اپنی بڑی بڑی پلکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

تم نے میرے ساتھ جانا ہی مناسب کیوں سمجھا؟

وہ اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔بس گاڑی میں اسکی آواز گونجی تھی۔علایا نے سکون کا سانس لیا تھا۔اب وہ اس سے بات کر سکتی تھی۔

کیونکہ ڈیڈ نے ایک بار مجھے کہا تھا کہ جن سے محبت ہوتی ہے ان سے جڑی ہر چیز آپ کو عزیز ہوتی ہے۔اس نے انتہائی معصومیت سے کہا تھا۔وہ اس کی اس معصومیت پر حیران تھا۔

زاویار سے تمہاری محبت ڈھکی چھپی نہیں ہے۔۔اور تم نے بتایا کہ زاویار مجھ سے محبت کرتا تھا۔تو تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں تھا جس پر میں اعتبار کر سکتی۔

اور اگر میں تمہارا یہ اعتبار توڑ دوں؟علایا نے ایک سائے کو اپنی طرف متوجہ دیکھا تھا۔اس سائے پر چاند کی روشنی پڑھ رہی تھی اور اس کے باعث اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔وہ سایہ مسکرایا تھا۔

تو مجھے لگے گا کہ تمہیں زاویار سکندر سے کوئی محبت نہیں تھی۔اس کے مسکرانے پر دل میں خوف کی لہر دوڑ گ ئی تھی مگر وہ پر سکون سے لہجے میں بولی۔

اس نے احمر کے چہرے سے مسکراہٹ کو غائ ب ہوتے دیکھا تھا۔

اسی کے ساتھ ایک جھٹکے سے اس نے گاڑی روکی تھی۔اس نے علایا کو شعلہ بار نظروں سے دیکھا تھا۔

علایا کے دل نے اسے خطرے سے آگاہ کیا۔

اح۔۔۔احمر۔۔۔وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔تم مجھے ڈرا رہے ہو احمر۔۔۔وہ بنا پلک جھپکائے اسے دیکھ رہا تھا۔

گاڑی اسنے سائیڈ پر روک دی تھی۔

علایا ملک تو کسی سے نہیں ڈرتی۔۔۔اس نے علایا کا ڈائی یلاگ دہرایا تھا جو اسنے کبھی احمر سے یونی میں کہہ دیا تھا۔اب اسے کیا پتہ تھا کہ یہ شخص اس کی ہر بات کو یاد رکھے بیٹھا ہے۔

احمر۔۔۔میرا بھروسہ مت توڑو پلیز احمر۔۔۔

احمر کی بدلی ہوئی آنکھوں سے اسے وحشت ہوئی تھی۔

افففف اللہ وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟

تمہیں کیا لگا کہ میں نے تمہیں معاف کر دیا؟ تمہارے باپ کے ہاتھوں پڑنے والے تھپڑ کے نشانات مٹ گ ئے مگر اس کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔اس نے تیز آواز میں کہا تو وہ یکدم سہم سی گ ئی۔

لڑکیاں کتنی ہی بہادر اور دلیر کیوں نہ ہوں لڑکوں کے آگے خود کو ہمیشہ کمزور اور بے بس ہی محسوس کرتی ہیں۔

احمر۔۔۔ان سب میں میرا کیا قصور۔۔۔۔؟اسکی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

اسے بے بس سا دیکھ کر احمر کو تسکین مل رہی تھی۔

تمہیں بہت غرور ہے نا اپنے چہرے پر؟اپنی دولت پر؟

آج میں دیکھتا ہوں کہ تمہیں میرے ہاتھوں سے کون بچائے گا؟

میں تمہارا چہرہ بگاڑ دونگا علایا۔۔۔پھر دیکھوں گا کہ تم اپنے اس بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ کب تک زندگی گزارو گی۔وہ اسے احمر نہیں لگ رہا تھا۔۔نہیں وہ احمر نہیں تھا،وہ تو کوئی وحشی سا درندہ تھا جو اپنے دل کی تسکین کیلئے خدا کی بنائی ہوئی خوبصورت مورت کو بگاڑنا چاہتا تھا۔

یہ گناہ کرتے ہوئے کوئی شرم، کوئی پشیمانی اس کے چہرے پر نظر تک نہیں آ رہی تھی۔

"گناہ کی لذت صرف گناہ کرنے سے پہلے تک ہی رہتی ہے، گناہ کرتے ہی وہ لذت ذلت میں بدل جاتی ہے جو ساری زندگی انسان کے ساتھ رہتی ہے۔ کیونکہ شیطان کا کام ہے بہکانا اور وہ انسان سے گناہ کروانے کے لئے سائے کی طرح اس کے سر پر سوار رہتا ہے اور جیسے ہی انسان بہکتا ہے اور گناہ سرانجام دیتا ہے تو شیطان ایسے غائب ہوتا ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔"

چاند بھی احمر کے اس شیطانی روپ سے بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا۔ آسمان پر تیزی سے بجلی چمکی۔ اس نے آسمان روشن ہوتے دیکھا تھا۔ اسے بارش پسند نہیں تھی، بجلی چمکنے سے اسے خوف آتا تھا۔ بادل گرجے اور تیزی سے اس کی گاڑی کا سامنے والا شیشہ دھندلا گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا تھا۔

اسنے اپنی ان خوبصورت آنکھوں سے جس میں موٹے موٹے آنسو تیر رہے تھے، احمر کا چہرہ دیکھا جو اسے دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ اسے احمر سے ایسی کسی حرکت کی امید نہیں تھی۔ وہ بت بنی اسے دیکھ رہی تھی۔

احمر نے اپنی سیٹ کے نیچے سے بوتل اٹھائی۔۔۔ علایا نے اس بوتل پر غور ہی نہیں کیا تھا

اور اچانک اس بوتل کو دیکھتے ہی اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور تیزی سے باہر کو لپکی۔

یہ تیزاب کی بوتل تھی جو احمر نے اپنے ہاتھوں میں تھام رکھی تھی۔

وہ پاگلوں کی طرح بھاگی تھی اور احمر بھی اس کے پیچھے ایسے ہی بھاگا تھا۔ہائی وے کے روڈ پر وہ بیچ میں نہیں بھاگ سکتی تھی تو سڑک کنارے بھاگنے لگی تھی۔ہر سو موت اسے نظر آرہی تھی۔

"ایک وہ تھا جس نے اس کی عزت بچانے کیلئے اپنی جان دیدی اور دوسرا یہ تھا جو ایک تھپڑ کے بدلے اس کی جان لے رہا تھا۔"

اذیت ہی اذیت تھی۔اس کا دل کرچی کرچی ٹوٹا تھا۔اس کے پیروں میں وہ کرچیاں چبھنے لگی تھیں۔

بادل کھل کر برس رہے تھے۔بارش کے باعث اس کا جسم لمحوں میں بھیگ گیا تھا۔ اس کے بالوں کی گیلی لٹیں چہرے پر چپک گ ئی تھیں۔ وہ دیوانہ وار بھاگ رہی تھی جب ہی بڑے سے پتھر سے لڑ کھڑا کر گری۔اس کے بازو اور گھٹنے بری طرح زخمی ہوئے۔اس نے اٹھنا چاہا مگر بے سود رہی۔رات کے اندھیرے میں گناہ کا کام سرانجام

دیا جارہا تھا۔ایک طرف شیطان اور اس کے چیلے جشن منا رہے تھے تو دوسری طرف اللہ کے فرشتے اداس بیٹھے تھے۔بدی لکھنے والے فرشتے نے اب تک قلم نہیں اٹھایا تھا کہ شاید یہ سنبھل جائے۔

احمر بھاگتا ہوا اس تک پہنچ چکا تھا۔

علایا نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے۔

خدا کے لئے مجھے بخش دو احمر۔۔۔وہ منت کر رہیہ تھی،رو رہی تھی۔۔۔بے بس تھی کیا کر سکتی تھی؟اپنے لئے اس مصیبت کو دعوت اس نے خود دی تھی۔

میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔۔۔وہ دھاڑا تھا اسی کے ساتھ اسنے تیزاب کی بوتل کھولی تھی۔

وہ رو رہی تھی مگر وہ اکیلی نہیں رو رہی تھی اس کے ساتھ آسمان بھی رو رہا تھا۔

اسی کے ساتھ آسمان و زمین نے علایا کو بے بس دیکھا تھا۔اس کی زوردار چیخ پر آسمان میں دراڑ پڑ گئی تھی۔وہ زور سے چلائی تھی۔۔۔اسی کے بعد علایا نے خود کو بلکتا سسکتا ہوا پایا تھا۔ گرم گرم مایا اس کے چہرے اور سر پر انڈیل دیا گیا تھا۔

وہ بری طرح تڑپ رہی تھی مگر وہاں فرق کسے پڑنا تھا؟

احمر نے خالی بوتل زمین پر پھینکی اور ایک شیطانی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر

گ ئی۔

****

گھڑی نے رات کے چار بجائے تو ملک صاحب کی اچانک آنکھ کھلی۔دل بھاری اور بوجھل سا ہونے لگا۔ کچھ دیر تو وہ بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے لیٹے رہے۔وہی ماضی کے گناہ یاد کر رہے تھے۔کچھ دیر یونہی بیٹھنے کے بعد وہ بیڈ سے نیچے آئے اور کھڑکی کے پاس جا کر کھڑے ہو گ ئے۔دیر تک یونہی اندھیرے کو دیکھتے رہے۔ یانھوں نے کھڑکی کے پٹرول کھولے تو ٹھنڈی ہوا ان کے وجود کو چھوتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔یہاں پر بھی بادل برسے تھے۔پودوں سے قطرہ قطرہ کر کے پانی ٹپک رہا تھا۔پانی کی ٹپ ٹپ انھیں مسرور کر رہی تھی۔کسی خیال کے تحت انھوں نے علایا کا نمبر ملایا۔۔

آپ کا موجودہ نمبر فی الحال بند ہے، برائے مہربانی کچھ دیر بعد رابطہ کیجی ئے۔

اس جملے سے ان کی پیشانی پر بل پڑ گ ئے تھے۔

ان کا دماغ وسوسوں کا شکار ہونے لگا۔ان کی الجھن مزید بڑھنے لگی۔

ہو سکتا ہے بیٹری ختم ہونے سے موبائی ل آف ہو گیا ہو۔انھوں نے سوچا تھا۔

وہ کمرے میں ٹہلنے لگے تھے پھر کسی خیال کے تحت انھوں نے ایمن کا نمبر ملادیا۔

کافی لمبی گھنٹی کے بعد لائن کٹ گئی۔

اس کا موبائل آن تھا تو انھیں امید تھی کہ وہ علایا سے بات کروادے گی۔

انھوں نے دوبارہ اس کا نمبر ملایا۔

پھر کچھ ہی لمحوں میں ان کا فون پک کر لیا گیا تھا۔

ہیلو۔۔۔وہ نیند میں بول رہی تھی۔

ایمن۔۔۔میری علایا سے بات کروادو۔وہ پر سکون ہو گئے تھے۔

ہیں۔۔۔انکل۔۔۔ایمن نے موبائل کان سے ہٹا کر اسکرین پر نمبر دیکھا۔

پھر کہنیوں کے بل سیدھی ہو کر بیٹھی۔سائیڈ ٹیبل پر رکھا اپنا لیمپ آن کیا۔

ملک انکل پاگل تو نہیں ہو گئے۔۔۔اس نے سامنے گھڑی میں ٹائم دیکھا۔وال کلاک میں چار بج کر ۲۰ منٹ ہو رہے تھے۔اس نے موبائل دوبارہ کان سے لگایا۔

انکل علایا تو میرے ساتھ نہیں ہے۔اس نے انھیں آگاہ کیا تھا۔

ملک صاحب کی دماغ سن ہونے لگا۔

یہ کیا کہہ رہی ہو۔۔۔وہ تمہارے ساتھ اسلام آباد نہیں گ ئی؟وہ ایک دم بولے تو ایمن نا سمجھی کے عالم میں سوچنے لگی۔

اسلام آباد؟؟انکل میں اسلام آباد میں نہیں۔۔۔میں تو گھر پر ہوں۔وہ انھیں بتا رہی تھی۔

یہ کیا کہہ رہی ہو؟تم دونوں کو گھومنے جانا تھا نا اسلام آباد؟وہ پریشانی کے عالم میں پوچھ رہے تھے اور وہاں ایمن جو جواب دے رہیہ تھی اس سے ان کے پیروں کے نیچے سے زمین اور سر کے نیچے سے آسمان کھسکتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

تو کیا وہ مجھے دھوکا دے کر کہیں اور چلی گ ئی ہے؟

کیا اسے سچ کا علم ہو گیا ہے جو وہ گھر چھوڑ گ ئی ہے؟انکے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ احمر کے ساتھ بھی جا سکتی ہے۔

****

احمر۔۔۔۔

وہ کافی دیر تک گاڑی ایک سائیڈ میں لگا کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔علایا کے

پکارنے پر وہ جیسے ہوش میں آیا۔دل و دماغ کی جنگ میں اس نے اپنے دل کی سنی تھی۔۔

"توبہ توبہ شیطان کیسے کیسے ہتھکنڈے اپنا رہا تھا،اسے بہکا رہا تھا مگر اس نے اپنے اندر کے برے انسان کو اپنے اچھے کردار پر حاوی نہیں آنے دیا۔"

اسنے علایا کی طرف دیکھا تو پیارا سا چہرہ ویسے ہی خوبصورت تھا۔

اس کا دوست اس لڑکی سے محبت کرتا تھا پھر وہ کیسے اس کے ساتھ کچھ برا بھی کرنے کا سوچ سکتا ہے؟

تم ٹھیک ہو؟اس کے اس طرح ری ایکٹ کرنے پر علایا کو جیسے اس کی فکر ہوئی تھی۔

میں ٹھیک ہوں۔۔۔بس تھوڑا تھک گیا ہوں۔۔اتنی لمبی ڈرائی یو میں نے کبھی نہیں کی اور پھر یہ بارش۔۔۔۔یہ رکے تو میں کچھ کرتا ہوں۔اس نے اپنا سر اسٹئی رنگ سے ٹکا دیا...وہ واقعی بہت تھک گیا تھا۔

احمر۔۔۔تم چاہو تو تھوڑی دیر گاڑی کسی کاروان سرائے پر روک سکتے ہو۔ اسنے اسے مشورہ دیا تھا۔

بارش تڑاتڑ برس رہی تھی۔احمر نے بوجھل آنکھوں سے اسے دیکھا۔پھر گاڑی اسٹارٹ کی اور آہستہ آہستہ ڈرائی یو کرنے لگا۔گاڑی اسنے ایک کاروان سرائے پر روکی۔یہ کافی

بڑا سرائے تھا جہاں اندر لکڑی کی ٹیبلیں رکھی تھیں اور اسکے ارد گرد کرسیاں رکھی تھیں۔ سرائے میں چند لوگ بیٹھے تھے۔گاڑی سے نکل کر وہاں تک جانے میں ان کے کپڑے بھی بارش کے پانی سے ذرا گیلے ہوئے تھے۔

سرائے میں داخل ہوتے ہوئے وہاں بیٹھے آدمیوں اور لڑکوں نے علایا کو اوپر ماحول سے نیچے تک تاڑا تھا۔اسے نا جانے کیوں ان سب کی نگاہوں سے الجھن ہوئی تھی۔وہ آدمی علایا کو دیکھنے لگے تو وہ بھی نگاہیں نیچے کرنے کے بجائے انھیں گھورنے لگی۔اس نے انھیں ایسے گھورا کہ وہ آدمی خود ہی اپنی نظریں گھما گئے۔

احمر نے ارد گرد نگاہ دوڑائی تو کونے پر رکھی ہوئی میز کے ساتھ دو کرسیاں خالی نظر آگئی یں۔ وہ قدم بڑھاتے ہوئے اس طرف چل دیا تو علایا بھی اس کے پیچھے ہولی۔

بارش کے باعث اسے سردی سی محسوس ہوئی تھی۔

مگر اس کے پاس تو ڈوپٹہ بھی نہیں تھا کہ اپنے آپ کو ڈھک لیتی۔

سرائے میں بہت ہلکی زرد روشنی تھی جس سے علایا کو الجھن ہونے لگی تھی۔وہ پہلے کبھی سرائے نہیں آئی تھی تو ایسے ماحول کی اسے عادت نہیں تھی۔

علایا کرسی پر بیٹھی اور دونوں ہاتھوں کو اس نے میز پر ٹکا دیا۔

تم کچھ کھاؤ گی؟احمر علایا سے مخاطب ہوا تھا۔

علایا نے اپنی گردن نفی میں ہلائی۔بس ایک کپ ہاٹ کافی۔۔

احمر نے قریب سے گزرنے والے ایک چھوٹے بچے کو بلایا اور اسے ایک کپ کافی اور ایک کپ چائے کا آرڈر دے دیا۔۔

تھوڑی دیر یونہی خاموشی رہی۔علایا اب بھی ان لڑکوں کی نظروں کی محویت کو خود پر پڑتے ہوئے محسوس کر سکتی تھی۔

تمہیں پتہ ہے کہ میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔۔اس نے علایا کو آگاہ کیا۔

جانتی ہوں۔۔۔وہ پر سکون سے لہجے میں بولی۔

یہ مت سمجھنا کہ یہ سب میں تمہارے لئے کر رہا ہوں۔۔۔۔میں جو کر رہا ہوں صرف اپنے دوست کیلئے کر رہا ہوں۔وہ اسے جتا رہا تھا۔

احمر۔۔۔تم اور میں ایک ہی انسان کی محبت میں گرفتار ہونے والے دو الگ شخصیات ہیں۔فرق یہ تھا کہ تم نے اپنی محبت ظاہر کر دی اور اسے سر کا تاج بنا دیا لیکن میں نے انا اور غرور میں رہ کر اس محبت کو اپنے پیروں کے نیچے کچل کر اسے زمین کی دھول بنایا۔

اس کی آنکھوں میں اداسی در آئی تھی۔

احمر حیران آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔علایا کے دل میں زاوی کی

محبت۔۔۔۔امپوسیبل!!اس نے سوچا

ٹھنڈی ہوا اسے چھوتے ہوئے گزری تو وہ یکدم ٹھٹھر گئی۔اس کے بال جو اونچی پونی

میں بندھے تھے وہ آہستہ سے جھولنے لگے۔

احمر نے اسے دیکھا تو وہاں سے اٹھا اور سرائے سے باہر چلا گیا۔

علایا کو پھر زاویار یاد آنے لگا۔۔۔اس کی نظریں یونہی سامنے جا ٹھہری جہاں ایک لڑکا

پشت کئے بیٹھا تھا۔بلکل وہی اسٹائیل سے بال بنے تھے جیسے وہ بناتا تھا۔ وہ دھوکا

نہیں کھا سکتی تھی۔یہ وہی تھا۔ علایا نے اسے دیکھا پھر یکدم ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی

اور قدم بڑھاتی ہوئی اس شخص کی طرف بڑھنے لگی۔ایک بار تو وہ زاویار سے ملنا چاہتی

تھی اور وہ اس سے ملنے بھی آیا تھا مگر خواب میں۔

قدم بڑھاتے ہوئے اسے اپنے اندر عجیب سا کچھ محسوس ہوا تھا۔یوں لگا جیسے کسی نے

مقناطیس لگا دیا ہو اور وہ اس کی طرف بڑھتی جا رہی ہو۔

احمر نے اسے آواز دی تو اس نے پلٹ کر اسے دیکھا۔اس کے ہاتھ میں ایک جیکٹ تھی

جو وہ اپنے بیگ سے نکال کر لایا تھا۔چند قدم کے فاصلے پر وہ شخص بیٹھا تھا۔علایا نے

آگے بڑھنا مناسب سمجھا۔وہ تیزی سے گھوم کر اس خصوصا کے سامنے آئی۔۔احمر حیرانی کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا۔

ایکسکیوزمی؟؟اس لڑکے نے علایا کو دیکھا تو اسکے لبوں سے بے ساختہ نکل گیا۔وہ لڑکا صرف پیچھے سے ہی زاویار میں ملتا تھا۔۔سامنے سے تو وہ کوئی بلوچی تھی۔علایا کے اسطرح دیکھنے پر وہ جیسے کنفیوز ہو گیا تھا۔

علایا نے نفی میں گردن ہلائی اور واپس اپنی جگہ پر آئی۔دل اداس اور ٹوٹ گیا تھا۔مرے ہوئے لوگ واپس نہیں آتے۔۔۔احمر نے ہاتھ میں پکڑی اپنی جیکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس نے اس کے ہاتھ سے جیکٹ تھامی اور اپنی کرسی پر بیٹھ گ ئی۔

بارش کے باعث ہوا کی شدت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔اس نے جیکٹ پہنی تو اپنے آپ کو کچھ کمفرٹیبل محسوس کیا۔کونے کی ٹیبل پر موٹے آدمی بیٹھے تھے۔ان کا قد بھی چھوٹا تھا۔وہ نشے میں لگتے تھے اور علایا کو ہی دیکھ رہے تھے۔پہلی بار اسے ان بھدے اور موٹے آدمیوں کی نظروں سے خوف آیا تھا۔

احمر غلط کہتا ہے۔۔۔اس نے سوچا تھا۔

جن سے حقیقی دنیا میں ملنے کی چاہے ہو وہ خواب میں ملنے آجاتے ہیں۔۔۔اس نے سوچا

تھا۔

احمر۔۔۔کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟اس نے انا کو سلاتے ہوئے اس سے مدد کی درخواست کی تھی۔

کیسی مدد۔۔۔۔؟احمر نے ابرو اٹھا کر پوچھا۔

میں چاہتی ہوں کہ تم یہ معلوم کرو کہ میرے ڈیڈ کا جاپانی سے کیا تعلق ہے؟اس نے دونوں ہاتھوں کو میز پر ٹکا رکھا تھا۔وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

میں یہ سب کیسے معلوم کر سکتا ہوں؟وہ جیسے حیران ہوا تھا۔

احمر تمہارے اور میرے ڈیڈ پارٹنرز بھی رہے ہیں۔۔۔تم یہ تو معلوم کر سکتے ہو کہ کیا کبھی ڈیڈ ماضی میں جاپان گئے ہیں؟وہ اسے سمجھا رہی تھی۔

یہ تو تم بھی معلوم کر سکتی ہو؟وہ شانے اچکاتے ہوئے بے نیازی سے بولا۔

میں نہیں معلوم کر سکتی احمر۔۔۔ڈیڈ نے مجھے ہمیشہ ایک راز سے بے خبر رکھا ہے۔میں اس راز تک جانا چاہتی ہوں۔۔علایا نے اسے جاپان سے آنے والے گفٹس سے بھی آگاہ کیا۔وہ اسے دوست سمجھ کر اپنے دل کی بات شئیر کرنے لگی اور وہ بھی اس کی تمام باتیں سننے لگا۔

بارش رکی تو وہ پھر سے اپنے سفر پر روانہ ہوئے۔علایا نے پرس سے موبائل نکالا تو اس

کا موبائی ل آف تھا۔اس نے موبائی ل بند ہی رکھنا مناسب سمجھا۔

اس نے آسمان کو دیکھا۔سورج کی کرنیں ہر سو پھیلنے لگی۔چرند پرند اپنے اپنے ٹھکانوں سے کوچ کر رہے تھے۔اسے یہ موسم بہت حسین لگا تھا۔وہ لوگ کوئی ٹہ میں داخل ہو چکے تھے۔آسمان بادلوں سے ڈھکا تھا۔سائی یڈ میں ہر طرف اونچے اونچے پہاڑ تھے اور ان کی گاڑی تیزی سے اس لمبی سڑک پر رواں دواں تھی۔سورج کی کرنوں نے علایا کو بھی اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔وہ نہیں جانتی تھی کہ اتنی تاریکی کے بعد اس کی زندگی بھی ایسے ہی روشن ہونے والی تھی۔

"جیسے اندھیرے کے بعد سویرا ہوتا ہے ویسے ہی دکھوں کے بعد سکھوں کے دورہ کا آغاز ہوتا ہے۔"

تمہیں پتہ ہے علایا زاویار نے مجھ سے کیا کہا تھا؟احمر بھی سورج کی ابھرتی ہوئی روشنی کو دیکھ رہا تھا۔ذہن میں زاویار سکندر کی بات یاد آگ ئی تھی۔

علایا جو ونڈ اسکرین سے باہر دیکھ رہی تھی،اس نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔

وہ کہہ رہا تھا کہ وہ وہاں جانا چاہتا ہے جہاں سورج طلوع ہوتا ہے۔وہ علایا کو بتا رہا تھا اور علایا اسے سن رہی تھی۔

پھر اسے اپنا خواب یاد آیا تھا۔۔ عجیب خواب تھا۔۔۔ دنیا اور دار اسلام کے راستے تلاشنے والے دو الگ الگ لوگ۔۔

گاڑی اب شہر میں داخل ہو چکی تھی۔ جس علاقے میں زاویار نے اپنا گھر بتایا تھا وہ جگہ کافی حسین تھی۔ اونچے اونچے باغات سے گزرتے ہوئے وہ لوگ اس جگہ پہنچ چکے تھے۔ جہاں احمر نے گاڑی روکی تو جہاں علایا حیران ہوئی تھی وہاں احمر کو بھی حیرانی کے جھٹکے لگے تھے۔

جو ایڈریس اسنے مجھے دیا تھا ہم وہاں پہنچ گئے ہیں علایا۔ احمر نے اس جگہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

آر یو شیور؟ وہ جیسے سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

جدھر اس نے گاڑی روکی تھی وہاں دو گارڈز کھڑے تھے۔۔ اسکی بلیک مرسیڈیز کو دیکھتے ہی انھوں نے اونچے اونچے لوہے کے دروازے کھول دیئے تھے۔ احمر نے گاڑی اندر لے لی۔ وہ اپنے اطراف میں دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ دونوں اطراف میں گھنے جنگل تھے اور اسی کے ساتھ خوبصورت باغ بنے تھے۔

بہت دور سے اسے ایک گھر نظر آ رہا تھا مگر قریب پہنچنے پر اس کی اور علایا کی آنکھیں پھٹنے لگی تھیں۔ اندونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔۔ آنکھوں میں وہی حیرت اور

پریشانی تھی۔یہ کوئی گھر نہیں تھابلکہ یہ توایک حویلی تھی۔حویلی بھی اتنی اونچی اور خوبصورت جسے دیکھ کر آنکھوں میں ستائی ش پیدا ہو جائے۔

وہ دونوں گاڑی سے باہر آئے اور حویلی کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔

علایانے اپنی گردن چاروں اطراف میں گھمائی۔اسے یہ حویلی اس کے محل سے کہیں زیادہ خوبصورت لگی تھی۔ محل کا اندرونی دروازہ لکڑی کا تھا۔جس کے درمیان میں نفیس ساڈیزائی ن بنا تھا۔

وہ دونوں گونگے ہو کر اس حویلی کو دیکھ رہے تھے۔

کچھ ہی دیر میں ایک لمبا اور چوڑا گارڈان کی طرف آیا۔

کس سے ملنا ہے؟اس نے اپنے سائی یڈ پر ایک بڑا سا پسٹل لٹکا رکھا تھا۔

یہ حویلی کس کی ہے؟احمر نے الٹا سوال کیا۔

آپ کو اس سے کیا مطلب؟گارڈ چڑتے ہوئے بولا۔

علایا اور احمر نے نے نظروں کا تبادلہ کیا۔

میں ملک ریاض کی بیٹی ہوں، کراچی سے آئی ہوں۔

میں یہ حویلی خریدنا چاہتی ہوں۔اسلئے اسکے آنر سے ملنا چاہتی ہوں۔علایا نے بات بناتے ہوئے ایک نظر احمر کو دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

م۔۔۔ملک ریاض کی بیٹی

اوہ۔۔۔تو آپ علایا ملک ہیں۔وہ جیسے اسے پہچان گیا تھا۔

جی۔اس نے ہاں میں گردن ہلائی۔

یہ زاویار سکندر کی حویلی ہے مگر وہ اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں۔گارڈ نے انھیں اطلاع دی تو وہ اور احمر کئی لمحے کو نسلروں پتھر کا مجسمہ بنے اس گارڈ کو دیکھنے لگے۔

یہاں نہیں ہیں۔۔۔۔مطلب؟دونوں کے ذہن میں ایک ہی سوال چل رہا تھا۔احمر نے بلآخر اس سے پوچھا۔

وہ کچھ عرصے کیلئے باہر گئے ہیں۔کہاں گئے ہیں یہ معلوم نہیں۔گارڈ کے اس جملے سے حیرت کے جھٹکے یقینی تھے۔

کیا اسے نہیں پتہ کہ وہ مر چکا ہے؟علایا کا دماغ الجھنے لگا۔

ہم زاویار سکندر کے والدین سے ملنے آئے ہیں۔علایا نے تیزی سے کہا۔

او جی بی بی۔۔۔ان کے والدین تو کافی عرصہ پہلے دنیا سے رخصت ہو گئے۔

علایا اور احمر نا سمجھی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

یہ کیا راز تھا؟اس نے تو کبھی یہ بات نہیں بتائی تھی کہ اس کے والدین اس دنیا میں نہیں ہے۔

کچھ ہی دیر میں گارڈ وہاں سے چلا گیا۔

علایا باہر کھڑی اس حویلی کو تکتی رہی۔ کیسی کشش تھی اس حویلی میں جو اسے آواز دے رہی تھی، کچھ ایسا تھا جو اسے اپنی طرف بلا رہا تھا۔

کون تھا زاویار سکندر جس نے آج تک لوگوں سے اتنا بڑا راز چھپایا تھا۔ اتنا امیر ہونے کے بعد وہ شیراز صاحب کے آفس میں کام کیوں کرتا تھا؟

وہ کراچی پڑھنے کی غرض سے کیوں آیا تھا؟

احمر اور علایا خاموشی سے وہاں سے نکل کر اپنی کار کی طرف آئے۔

یہ سب کیا ہے احمر۔۔؟ میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی۔ علایا گاڑی میں بیٹھتے ہی بولی۔

سمجھ تو مجھے بھی نہیں آ رہا کچھ۔ احمر نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اس حویلی سے باہر آیا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ زاویار زندہ ہے اور وہ جو حادثہ ہوا وہ سب ایک پری پلین کے تحت ہوا۔ علایا نے سوچتے ہوئے کہا۔

بلکل مجھے بھی ایسا لگ رہا ہے اور اگر ایسا ہے تو اس میں ڈیڈ اور ملک انکل بھی ملوث ہیں۔

وہ اپنے خیال کے تحت سوچتے ہوئے بولا۔

مگر ایسا کیوں کیا؟ احمر نے گاڑی چلاتے ہوئے علایا کو دیکھا۔

اور جب ہی علایا کے دماغ میں ساری گتھی سلجھنے لگی۔

اسنے ڈیڈ سے کہا تھا کہ وہ زاویار سکندر کی موت چاہتی ہے تو ڈیڈ نے اس کے لئے یہ سارا ڈرامہ کیا کہ کہیں وہ خود سے اسے نقصان نہ پہنچادے۔وہ سب سمجھنے لگی تھی۔

اس نے احمر کو بتایا تو اس نے اسے تیز کاٹتی ہوئی نظروں سے گھورا۔

تو تم میرے دوست کو مروانا چاہتی تھیں۔اس کی آواز تیز تھی۔

آ۔۔۔ہاں۔۔مگر وہ تو میں نے ایسے ہی کہا تھا۔وہ نظریں چرا گئی۔

چلو۔۔۔ویسے کہتے ہیں جو ہوتا ہے اچھے کے لئے ہوتا ہے۔اس واقعے سے تمہاری دشمنی تو ختم ہوئی۔اسے یونہی اس پر ہنسی آگئی۔

اب ہم زاویار کو کہاں ڈھونڈیں گے؟علایا کو یکدم ہی اس کا خیال آیا۔

علایا ملک زاویار کی اتنی فکر مت کرو۔۔یہ سب وہ ہضم نہیں کر پائے گا۔وہ ہنستے ہوئے بولا تو علایا نے جھینپ کر سر نیچے کر لیا۔

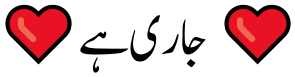
جاری ہے

ہماری ویب میں شایع ہونے والے ناولز کے تمام جملہ و حقوق بمعہ مصنفہ کے نام محفوظ ہیں۔

ہمیں اپنی ویب نیو ایرا میگزین(New Era Magazine)کیلئے لکھاریوں کی ضرورت ہے۔اگر آپ ہماری ویب پر اپنا ناول، ناولٹ، افسانہ، کالم، آرٹیکل، شاعری، پوسٹ کروانا چاہیں تو اردو میں ٹائپ کر کے مندرجہ ذیل ذرائع کا استعمال کرتے ہوئے ہمیں بھیج سکتے ہیں۔

(Neramag@gmail.com)

(انشااللہ آپ کی تحریر ایک ہفتے کے اندر اندر ویب پر پوسٹ کر دی جائے گی۔مزید تفصیلات کیلئے اوپر دیئے گئے رابطے کے ذرائع کا استعمال کر سکتے ہیں۔

شکریہ ادارہ: نیو ایرا میگزین